کردارِ خاتونِ کربلا

جلد اوّل

مصنفہ

جناب مہتاب جعفر رضا صاحب بدایونی
ایم-اے (فلسفہ) و ایل-ایل-بی (علیگ)

کردارِ خاتونِ کربلا

جلد اوّل

مصنّفہ

جناب جعفر رضا صاحب بدایونی

ایم۔اے (فلسفہ) و ایل۔ایل۔بی (علیگ)

قیمت عمر

انتساب

فرض شناس خواتین کے شرف اور عزّت ناموس کے نام
اپنی ایک حقیر کوشش

[مہتاب]

فہرست

مقدمہ

علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری

۱

فضیلت وکمال کے دانشکدہ میں "اُم الکتاب" "مصائب انبلار کی دنیا میں" "ام المصائب" مہبط وحی وتنزیل رسول خاتم کے اصول حکمت ومعرفت کی وارث، ہمّت وحسن بیان وخلوص میں حیدر صفدر علی حکیم کی پرتو، احتجاج وغیرت دین اور ذہن وکردار کی عصمت میں مثیل زہرا، خامس آل عبا سید الشہدا کی شریک کار اسرار امامت کی امین اور بیمار امام سید سجاد حضرت زین العابدین کی کفیل حضرت زینب کبریٰ سے وہی شخص ناواقف ہوگا جسے المیہ کربلا کی کوئی خبر نہیں۔ یا جس نے عالمی تحریکات کی تاریخ نہیں پڑھی ہے یا جس کے سامنے ثائرت کے ارتقار اور اس کے زرّیں خدمات یا اُس کے اخلاقی فتوحات کے کارنامے نہیں ہیں۔

۲

تاریخ کے سامنے صنف نازک کی مثالی شخصیت خاتون جنّت کی تھی۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے گفتگو اور بیان میں رسول اللہؐ سے کسی کو فاطمہؑ سے زیادہ مشابہ نہیں پایا۔ جب حضرت فاطمہؑ آتیں تو جناب رسول خدا ان کے استقبال کو آگے بڑھتے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ حضرت عائشہ ہی کا بیان ہے کہ میں نے فاطمہؑ سے اُن کے باپ کے سوا کسی کو افضل نہیں پایا۔ (ص ۳ — اشرف المؤید لال محمد از علامہ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی بیروتی شافعی موجود ۱۳۱۸ھ) سرورِ عالم نے خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا سے فرمایا — بیٹی! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ کل عالم کی عورتوں کی سردار ہو۔ خاتون جنّت نے پوچھا بابا پھر مریم کی کیا جگہ ہوگی۔ فرمایا وہ اپنے عالم کی عورتوں کی سردار تھیں قدرت کی فیاضی نے ثانیٔ زہرا حضرت زینب کبریٰ کو اُن کا شبیہ بنا دیا اور انھیں ان بہترین صفات سے آراستہ کیا کہ ان کو دیکھ کر خاتون جنت کے کمالات پر روشنی پڑنے لگی۔

خصوصًا قوت برداشت کے عطیہ سے جس قدر قدرت نے ثانیٔ زہرا کو نوازا اُسے انسانی معجزہ کہہ لیجیے یا حجۃ الاسلام شیخ محمد حسین اصفہانی نجفی کے شعر کی زبان میں اسے عجائب روزگار کی فہرست میں شامل کر لیجیے۔

لھا من الصبر علی المصائب
ما جلّ ان یُعدّ فی العجائب

۳

اگرچہ خاتونِ کربلا نانا (سرورِ امم حضرت رسولؐ خدا) اور ناں (خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا) کی وفات کے وقت تقریبًا سات سال کی تھیں لیکن ذہنی توانائی اور فکری بلوغ کی تجلیوں سے اُن کی زندگی کا تار تار روشن تھا۔ اسی سن میں انھیں سیّدۂ عالمؑ کا فدک کا تاریخی خطبہ زبانی یاد تھا۔ انھیں کی نسبت سے خاندان والے مخزونا زسے اس تقریر کی روایت کرتے تھے۔

حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ثقافتی زندگی، تخلیقی خدمات، اور انسان ساز ماحول سے کتنے مردوں اور عورتوں نے معیاری فکر وعمل کا درس لیا۔ اور کامیاب انسان بنکر تاریخ کے فلک پہ چمکتے ہوئے ستارے بن گئے۔ اس بحرِ ذخّار سے خاتونِ کربلا نے اس عہد کی خواتین میں سب سے زیادہ فیض اٹھایا۔

۴ ———

خاتون کربلا کی بے نظیر صلاحیتوں کے اعتبار سے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا جو اُن کے شریکِ زندگی ہونے کے لیے موزوں ہوتا ——— خاندان میں عبداللہ بن جعفر کئی وجہ سے اس رشتے کے اہل سمجھے گئے۔

وہ قومی شہید حضرت جعفر طیار کے بیٹے تھے۔ حضرت علی کے حقیقی بھتیجے ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ہی کی آغوش میں اُن کی تربیت ہوئی تھی۔ خاتون کربلا اور اُن کے تصوّراتِ زندگی میں ہم رنگی تھی۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے سیراب ہوئے تھے۔

عبداللہ علم و ادب و فقہ و حدیث کے خوشہ چین تھے مشہور مؤرخ سلیم بن قیس ہلالی ان سے روایت کرتے ہیں ——— سخاوت و مہمان نوازی سے ان کا لقب "عبداللہ بن جعفر جواد" پڑ گیا تھا۔

وہ سماج کے ہمدرد و خبر گیر تھے اہل مدینہ ایک دوسرے سے اس وعدے پر قرض لیتے کہ عبداللہ بن جعفر کے پاس سے ہمارا وظیفہ آئے گا تو ہم قرض ادا کر دیں گے۔ واقعۂ کربلا میں صحت کی خرابی اور بعض دوسری شرعی مصلحتوں کی وجہ سے وہ شریک نہ ہو سکے لیکن ان کی نیابت میں ان کے فرزندوں نے اپنی قربانیاں پیش کیں سنہ ۸۰ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حضرت عبداللہ جناب زینب کے بڑے قدر دان تھے شادی کے بعد حضرت عبداللہ اور جناب زینبؑ دونوں حضرت علی ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ جب حضرت علی نے اپنے زمانۂ حکومت میں کوفہ کو وطن بنا لیا تو حضرت عبداللہ اور جناب زینب نے بھی امام ہی کے ساتھ کوفہ میں قیام کیا۔ امیرالمومنینؑ کی شہادت ماہ رمضان سنہ ۴۰ھ میں ہوئی۔ امیرالمومنینؑ باری باری امام حسن و حسین اور خاتون کربلا کے یہاں افطار فرماتے تھے۔ خود خاتون کربلا بیان فرماتی ہیں کہ ۱۹ رمضان کو امیرالمومنینؑ کا افطار میرے یہاں تھا۔ (نزہتہ المحبین فی فضائل امیرالمومنینؑ از علامہ شیخ جعفر نقدی مرحوم مطبوعہ نجف ۱۹۵۰ء)

۵ ———

امیرالمومنینؑ کے زمانہ میں بھی امام حسن و حسین اپنی عزیز ترین بہن کی طرف بہت متوجہ تھے۔ ان کے گھر کے چھوٹے بڑے مسائل میں دلچسپی لیتے ——— اسی روایت افطار میں خود حضرت زینبؑ کی زبانی مذکور ہے کہ وہ بطیں جو روز شہادت امیرالمومنین کے دامن سے لپٹ رہی تھیں وہ امام حسینؑ ہی کا تحفہ تھیں۔

امیرالمومنین کی وفات کے بعد تو بھائیوں کے مہر و لطف نے باپ کی شفقت کا مزہ دیا۔

امام حسن کی شہادت کے بعد امام حسینؑ بہن کی نظر میں بزرگوں کی یادگار اور نشانی رہ گئے تھے۔ امام حسینؑ کی نظر میں بہن کی صلاحیتوں کی قدر اور ان سے غیر معمولی اُنس کا یہ حال تھا کہ وہ ان کی معمولی معمولی باتوں پر بھی توجہ رکھتے۔

طرفین کی باہمی بے انتہا محبت کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ حضرت زینب کے تمام نجی اور گھریلو مسائل بھی امام حسین کے اشارے کے بغیر انجام نہ پاتے ——— حضرت زینب اور عبداللہ دونوں امام حسین کو اپنا سرپرست و نگران سمجھتے۔ بلکہ ایک نسبی رشتہ سے زیادہ دونوں امام کو خدا کا ولی اور رسول کا نائب سمجھتے۔

معاویہ نے مدینہ کے گورنر مروان کو لکھا کہ بنت عبداللہ بن جعفر سے یزید کی منگنی کرو۔ ان کے باپ جتنا مہر چاہیں مقرر کریں ہمیں منظور ہے۔ ان کا قرضہ بھی ادا کر دیا جائے گا ——— مروان نے جب یہ پیام ان کو پہنچایا تو پہلی بات جو حضرت عبداللہ کے منھ سے نکلی تھی یہ تھی کہ یہ مسئلہ حسینؑ سے متعلق ہے۔ امام کو جب خبر ہوئی آپ نے فوراً ان کا عقد اپنے بھتیجے قاسم بن محمد سے کر دیا

عبداللہ بن جعفر نے امام حسین کے سفرِ شہادت کے موقع پر جو باتیں کہی تھیں وہ ان کا عقیدہ تھیں "آپ خدا کا نور۔ ہدایت کا نشان اور مومنین کی امید ہیں" (مقتل الحسین خوارزمی ج۱ ص۲۱۸)

۶ ———

خاتون کربلا کی ولادت سے واقعۂ کربلا تک اُن کی زندگی کے پچاس سال ایسے مختلف دور سے گزرے جن کے اثرات سے تاریخ بوجھل ہے ——— ان کا مقصد زندگی تبلیغ تھا۔ انھوں نے اپنا ایک میدان عمل بنا لیا تھا۔ بیدار ذہنی۔ بصیرت، ذمہ داری و فرض شناسی سے وہ شخصی و اجتماعی زندگی کی خدمت کرتی رہیں۔ عبادت اور شوہر اولاد، خاندان، ہمسایہ و ملت کی بے لوث خدمت

میں ان کے روز و شب گزرتے ـــــ اگر ان کی زندگی کی ایک سرسری تقسیم کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک دور آغاز شعور سے امام حسین سے سوال بیعت پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور مدینہ سے امام کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور سید الشہدا کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا دور کربلا کی تمام غریبالی سے شروع ہوتا ہے اور دمشق میں رہائی کے بعد مدینہ واپسی پر ختم ہوتا ہے۔ باقی زندگی اسی آخری دور کی تشریح ہے۔

۷ ـــــــــــــ

امام نے جب رخت سفر باندھا تو دوست، دشمن موافق و مخالف نے مختلف مشورے دیئے۔ ابن عباس بھی جن کے خلوص میں ہمیں شک نہیں امام کو مشورہ دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لیجائیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ بھی اسی طرح نہ قتل کر دیئے جائیں جس طرح عثمان قتل ہوئے اور ان کے بچے ان کے قتل کا منظر دیکھتے رہے (اخبار الطوال ابو حنیفہ دینوری) سنہ ۲۸۲ھ ص۲۴۴ مطبوعہ مصر)۔

محمد بن حنفیہ اور عبداللہ بن جعفر کے مشورہ میں یہ ٹکڑا نہیں ملتا۔ اس لیے کہ ابن عباس کی بہ نسبت یہ لوگ خاتون کربلا کی صلاحیتوں سے زیادہ واقف تھے۔ ابھی تک کوئی ایسا موقع نہیں آیا تھا جس میں حضرت زینب کی انفرادیت اور شخصیت کا علم سب کو ہوتا۔ عبداللہ بن جعفر نے مکہ سے اپنے دو فرزند محمد اور عون کو امام حسین کے ساتھ کر دیا تھا۔ عون تو حضرت زینب کے بطن سے تھے۔ لیکن محمد کی ماں خوصا بنت حفص تھیں۔ عبداللہ بن جعفر کا کوئی بعید اشارہ بھی نہیں ملتا کہ انہوں نے خاتون کربلا کو اس سفر سے روکا ہو۔ عون و محمد خصوصاً محمد کو ساتھ کرنا جو حضرت زینب کے بطن سے بھی نہ تھے ان کی سو فی صدی رضامندی اور سفر میں شرکت کی خواہش اور اس سعادت میں حصہ لینے کی آرزو کی روشن علامت ہے۔ عبداللہ بن جعفر کی طرح عون بن جعفر بھی امیرالمومنین کے بھتیجے اور داماد تھے وہ بھی اپنی بیوی ام کلثوم کے ساتھ امیرالمومنین کے ساتھ رہتے تھے اور امیرالمومنین کی شہادت کے بعد امام حسن کے ساتھ دونوں رہنے لگے تھے اور امام حسن کی شہادت کے بعد امام حسین کے ساتھ رہے اور دونوں امام کے ساتھ کربلا آئے۔ عون بھی کربلا میں شہادت کا آب حیات پی کر زندۂ جاوید ہو گئے (ص۲۵۲ تنقیح المقال ج۲ مامقانی)۔

۸ ـــــــــــــ

حسینی قافلہ میں امام حسین کے بعد دوسری نمایاں شخصیت خاتون کربلا کی تھی۔ اس کاروان میں خاندان کے مردوں عورتوں سب ہی کی نگاہ خاتون کربلا کے چشم و ابرو پر رہتی۔ بلکہ خود سید الشہدا ان سے اپنا درد دل بیان کرتے ـــــ اس سفر میں خاتون کربلا اپنی پوری بصیرت و بیداری کے ساتھ شریک تھیں۔ ان کی حساس طبیعت مستقبل میں ہونے والے واقعات کا عکس لیتی رہتی۔

ان کا گوش حق نیوش ہاتف کی آواز سنتا۔ ان کی آنکھیں آنے والے واقعات کی پرچھائیاں دیکھتیں ـــــ جب یہ قافلہ منزل خزیمیہ پر پہنچا اور امام نے ایک شب و روز وہاں قیام فرمایا تو صبح کو خاتون کربلا نے بھائی سے بیان کیا ـــ میں نے کل رات کو ہاتف کو یہ کہتے ہوئے سنا

الا یا عین فاحتفلی بجھد
فمن یبکی علی الشھداء بعدی
علی قوم تسوقھم المنایا
بمقدار الی انجاز وعد

امام نے اس کے جواب میں فرمایا جو قضائے الٰہی میں گزرا ہے وہ ہوگا (ص۲۲۲ مقتل الحسین خوارزمی م۵۶۸ھ)

خاتون کربلا امام کے لمحہ بہ لمحہ حالات اور دشمن کے اقدامات پر نظر رکھتیں ـــــ فاضل ابن نما م۶۴۵ھ کے بیان کے مطابق جب ۲ محرم کو امام نے حسرت آمیز اشعار پڑھے جن میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر تھا اور جن میں اپنی خبر مرگ کا اشارہ تھا تو خاتون کربلا نے بھی وہ شعر سنے اور اس سے پورا پورا اثر لیا تھا۔ ([illegible]) نے بھی ایک ایسا ہی واقعہ شب عاشور کا لکھا ہے جس کے بعض اجزا غالباً ۲ محرم کے واقعہ سے مخلوط ہو گئے ہیں ـــــ اس موقع پر خاتون کربلا نے جو کچھ بیان کیا

جس کہا اس سے اس انداز فکر کا اظہار ہو گیا کہ وہ امام حسین کو کس نظر سے دیکھتی تھیں ——— انھوں نے فرمایا ——— آج مجھے محسوس ہوا کہ اپنی ماں باپ بھائی کے داغ جدائی سینہ پر اٹھا رہی ہوں۔ (طبری $\frac{239}{4}$) امام نے ان کی توجہ کو غم فراق سے ہٹانے کے لیے ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں بیمار امام کے پاس لا کر بٹھا دیا اور انھیں صبر کی وصیت کی ۹ محرم کی شام کو جب اچانک فوج دشمن نے حملہ کیا اور شور و غل ہونے لگا اور امام کی آنکھ لگ گئی تو خاتون کربلا ہی نے آپ کو بیدار کیا اور حالات سے مطلع کیا۔ ($\frac{29}{4}$ تاریخ ابن اثیر)

اپنے بھتیجوں میں شبیہ پیغمبر حضرت علی اکبر اور بیمار امام سید سجاد کو انھوں نے انکی ماں کی موت کی تلخی محسوس ہونے نہ دی ان سے ان کی دلچسپی ایک پھوپھی کی نہیں بلکہ ایک فدائی ماں کی سی محسوس ہوتی ہے۔

حضرت علی اکبر کی شہادت اور نانا کی جیتی جاگتی تصویر کے مٹ جانے پر خاتون کربلا کے تاثرات غم نہایت شدید تھے۔ وہ حضرت علی اکبر کی لاش پر یا حبیباہ یا ثمرۃ فواداہ یا نور عیناہ کہتی ہوئی آگئیں۔ اور میت پر گر پڑیں امام نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں ان کے خیمے میں پہونچا دیا (~~$\frac{1}{4}$~~ جلاء العیون)

چھوٹے بڑے واقعات سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ خاتون کربلا کو سید الشہداء کی زندگی میں کتنا دخل تھا۔ عاشور کو جب امام لباس کہنہ مانگتے ہیں تو تاریخ انھیں کا نام پیش کرتی ہے ہم نہیں بتا سکتے ان لمحات کا سامنا خاتون کربلا نے کس طرح کیا جن میں امامت کی شمع بجھائی جا رہی تھی اور قاتل امام کی رگ حیات کو قطع کر رہا تھا تاریخ کو ان کا اس موقع کا ایک فقرہ یاد رہ گیا ہے۔ کاش آسمان زمین پر پھٹ پڑتا" ——— معلوم نہیں کس حسرت و مایوسی سے خاتون کربلا نے ابن سعد سے کہا۔ کیوں عمر۔ ابو عبداللہ حسین قتل ہو رہے ہیں۔ اور تو دیکھ رہا ہے۔ تاریخ نے اس فقرہ کا یہ اثر بتایا ہے کہ۔ ابن سعد کی آنکھوں سے آنسو ڈھل پڑے اور رخسار اور داڑھی پر بہہ نکلے۔ اس نے اپنا منھ خاتون کربلا کی طرف سے پھیر لیا ($\frac{1}{4}$ تاریخ ابن اثیر)

——— ۹

شہادت امام کے بعد خاتون کربلا کا کردار ایک مخصوص شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں موقع شناسی ضبط و صبر عزیزوں کو تسلی مقصد شہادت کی حفاظت و تشریح شامل ہے۔

امام کی شہادت کے فوراً ہی بعد بے پردہ راست مخدرات عصمت کا دور ابتلا شروع ہو گیا ——— خیمے لوٹے گئے۔ آگ لگائی گئی۔ بی بیوں کی چادریں چھینی گئیں۔ ان ہولناک و زہرہ گداز ہوش ربا مصائب کو خاتون کربلا نے یوں انگیز کیا جیسے کوئی جہاز ران انتہائی ہوش و گوش سے کام لیکر طوفان میں جہاز کے بچانے کی فکر کرتا ہے، اور مسافروں کی تسلی سے غافل نہیں ہوتا ۱۱ محرم کو پسماندگان امام کا قافلہ ابن زیاد کے پاس لیجانے کے لیے گنج شہیداں سے گزارا جاتا ہے۔ بیمار امام کی حالت اس منظر کو دیکھکر یاس انگیز ہو جاتی ہے۔ خاتون کربلا انھیں سنبھالتی ہیں۔

لیکن پھر خود اس دردناک منظر کے متعلق انکے تاثرات کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں ——— فرماتی ہیں اے محمد آپ کی نماز جنازہ ملائکہ آسمان نے پڑھی تھی۔ لیکن یہ حسین ریت پر پڑے ہوئے ہیں ان کے اعضا ٹکڑے ٹکڑے ہیں۔ اور آپ کی بیٹیاں قیدی بنائی گئی ہیں۔ اور آپ کی ذریت کو قتل کر دیا گیا ——— تاریخ نے خاتون کربلا کی اس پُر سوز آہ و فغاں کی تاثیر پر کچھ اشارہ کیا ہے ابن اثیر نے لکھا ہے ($\frac{2}{4}$) کہ ان کی فریاد سے کل دوست دشمن رو پڑے۔

——— ۱۰

کوفہ کے بازار و دربار میں خاتون کربلا کی آتشیں تقریر نے لاجواب اثر چھوڑا ہے۔

اسحاق بن خزیمہ نے سنہ ۶۱ھ میں اپنے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے خاتون کربلا کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ——— خدا کی قسم زینب سے بہتر کوئی مقرر نہیں دیکھا۔ گویا حضرت علی کی زبان سے برجستہ بول

رہی ہیں ——— خاتونِ کربلا نے مجمع سے اشارے سے کہا۔ خاموش ہوجاؤ۔ تاریخ نے اس اشارے کی ہیبت کو اس طرح بیان کیا ہے۔ سانسیں رک گئیں اور باجے خاموش ہوگئے۔

حمد و ثنا اور صلوٰۃ کے بعد خاتونِ کربلا نے یادگار تقریر فرمائی

(البیان والتبیین جاحظ)

اس موقع پر بیمار امام نے پھوپھی کی بے پناہ اعلیٰ صلاحیتوں پر بڑے ہی بلیغ انداز میں تبصرہ کیا۔

"آپ خدا کے فضل سے ایسی عالمہ ہیں جنھیں تعلیم نہیں دی گئی اور ایسی فہیم ہیں جنھیں کسی نے سمجھایا نہیں" جب یہ قافلہ ابن زیاد کے دربار میں لایا گیا تو خاتونِ کربلا نے نہایت معمولی کپڑے پہن لیے۔ اور اپنا ایسا حال بنالیا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ کنیزوں نے بھی انھیں اپنے حلقے میں لے لیا ——— ابن زیاد نے کہا یہ کون بیٹھی ہے۔ خاتونِ کربلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے تین بار یہی سوال کیا۔ آخر میں ایک کنیز نے بتایا کہ یہ زینبؑ بنت فاطمہؑ ہیں ——— ابن زیاد نے کہا ——— اس خدا کا شکر جس نے (معاذ اللہ) تم کو رسوا کیا اور تمہیں قتل کیا اور تمہارا پول کھول دیا۔ خاتونِ کربلا نے فرمایا اس خدا کی حمد جس نے ہمیں محمدؐ کے ذریعے سے بزرگی بخشی اور ہمیں ہر عیب سے پاک بنایا۔ ایسا نہیں ہے جیسا تو کہتا ہے۔ رسوا فاسق ہوتے ہیں۔ اور جھوٹ فاجر بولتے ہیں ——— ابن زیاد نے کہا تم نے دیکھا اللہ نے تمہارے اہلبیتؑ کے ساتھ کیا کیا۔ فرمایا تقدیر الٰہی نے قتل ان کے لیے معین فرمایا تھا وہ لوگ اپنی خوابگاہوں کی طرف چلے گئے۔ جلد ہی اللہ تجھے اور انھیں اکٹھا کرے گا اور وہ خدا سے انصاف کے طالب ہوں گے ——— ابن زیاد مشتعل ہوگیا۔ کہنے لگا خدا نے تمہارے سرکش و نافرمان اہلبیت کے قتل سے مجھے شفا دی۔ جب بات یہاں تک پہونچی تو خاتونِ کربلا رو پڑیں۔ اور فرمایا یہ ٹھیک ہے کہ تو نے ہمارے ادھیڑ عمر کے آدمیوں کو قتل کردیا۔ اور میرے اہل کو باہر نکالا۔ میری شاخ کو کاٹا۔ میری جڑ اکھیڑ دی۔ ان باتوں سے تجھے شفا ہوسکتی تھی تو واقعی تو نے شفا پائی۔ ابن زیادہ اس دندان شکن جواب سے بدحواس ہوگیا۔ اس نے خاتونِ کربلا کی گفتگو اور ان کی صداقت کے اثر کو گھٹانے اور بیان کی مقبولیت کے اصلی سبب پر پردہ ڈالنے کے لیے اُسے سجع و قافیہ بازی کی طرف منسوب کرکے وقتی طور پر شرمندگی کا پسینہ اپنی پیشانی سے پونچھنا چاہا۔ خاتونِ کربلا نے فرمایا کہ عورت کو سجع بازی سے کیا دلچسپی

(تاریخ کامل ابن اثیر ۳۴ھ)

شیطان ابن زیاد بیمار امام سے الجھنے لگا۔ خاتونِ کربلا کی طرح ابتدا میں امام بھی خاموش رہے اور اس کی بات کا جواب نہیں دیا لیکن جب اس نے بار بار کریدا تو امام کی منطق نے اُسے مبہوت کردیا۔ اس نے اپنی جھنجھلاہٹ کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے امام کے قتل کا حکم دیدیا۔ جب خاتونِ کربلا نے یہ حکم سنا تو بھتیجے سے لپٹ گئیں۔ اور ابن زیاد سے فرمایا کہ تو نے ہمارا جس قدر خون بہایا ہے تیرے لیے بہت کافی ہے۔ کیا تو نے کسی ایک کو بھی ہمارے آدمیوں میں سے زندہ چھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تو مومن ہے تو میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ ان کے ساتھ مجھے بھی قتل کردے۔ ابن زیاد کچھ دیر تک خاتونِ کربلا کے اس جذبہ قربانی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ حیرت ہے قرابت کے اثر پر واللہ میرا خیال ہے کہ ان کی خواہش تھی کہ اگر میں زین العابدین کو قتل کروں تو ان کو بھی قتل کردوں۔

(۴۳ھ تاریخ کامل ابن اثیر)

———— ۱۱

دمشق شام میں جب خاتونِ کربلا کا داخلہ ہوا تو ان کے نفسیات بلند نے قوت کے ساتھ اپنے جوہر دکھائے۔ مشرقی دنیا کے مشہور و معروف فاضل فرید وجدی مصری مرحوم نے اپنی دائرۂ معارف قرن عشرین (۷۹۵ مطبوعہ مصر ۱۳۴۳ھ) میں خاتونِ کربلا کے ذکر کا آغاز ان لفظوں میں کیا ہے۔ "کانت من فضلیات النساء و عقلیات العقائل" فرید وجدی نے سرسری طور پر امام کی شہادت اور حرم محترم امام کی دربار ابن زیاد میں پیشی پھر دمشق میں داخلے کے ذکر کے بعد لکھا ہے ——— جب یہ قیدی دربار میں لائے گئے تو یزید نے حکم دیا کہ ایک طشت میں امام کا سر رکھا جائے۔ یزید امام کے دانتوں پر چھڑی سے بے ادبی کرتا تھا۔ اور یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

یا غراب البین اسمعت فقل
انما تذکر شیئاً قد فعل

لیت اشیاخی ببدر شہدوا
جزع الخزرج من وقع الاسل
لاہلوا واستہلوا فرحا
ثم قالوا یا یزید لا تشل

زبعری

(عبداللہ بن زبعری کے اشعار پر تضمین کرتے ہوئے اُن سے کہا ہے) آج اگر ہمارے بدر کے مقتول سردار زندہ ہوتے تو وہ خوش ہوتے اور کہتے اے یزید تیرا ہاتھ کبھی شل نہ ہو ـــــ

فرید وجادی لکھتے ہیں ـ حالانکہ زینب اسیر تھیں لیکن یزید سے یہ شعر سن کر انھوں نے کہا ـ

"اے یزید اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا ہے ـــــ پھر جن لوگوں نے بُرائی کی تھی اُن کا انجام بُرا ہی ہوا ـ کیونکہ ان لوگوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا تھا اور ان کے ساتھ مسخراپن کیا ـ (پ۲۱ ـــ ۳۰ ـ روم)

فرید وجادی نے خاتون کربلا کی معرکہ آرا تقریر کا اقتباس بھی دیا ہے ـ جس میں وہ فرماتی ہیں ـ

ـــــ اے یزید تو نے آسمان و زمین کو ہم پر تنگ کر کے قیدیوں کی طرح در بدر پھرا کے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم اللہ کے نزدیک ذلیل ہوگئے اور تجھے اس سے بزرگی مل گئی ـ تو دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق پاکے اترا رہا ہے ـ حالانکہ قدرت نے (مصلحتاً) تجھے ڈھیل دے رکھی ہے ـــــ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم نے ان کو جو مہلت و فارغ البالی دی ہے وہ اُن کے حق میں بہتر ہے ـ (پ۴ ـــ ۱۷۸ ـ ۳ آل عمران)

یہ بھی فرمایا کہ ـــ اے فتح مکہ کے موقع پر آزاد کردہ غلاموں کی اولاد اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو نے پردہ میں رکھا ہے اور رسول کی بیٹیوں کی پردہ دری کی اور دربدر ان کی تشہیر کی ـ تیری گستاخی کی یہ حد ہے کہ تو کہتا ہے کاش میرے خاندان کے بدر کے کشتہ بزرگ آج زندہ ہوتے اور یہ منظر دیکھتے ـ تو چھڑی سے (ابو عبداللہ حسین) کے دانتوں سے بے ادبی کر رہا ہے ـ تو نے ذریت رسول کا خون بہا کر عترت رسول کی بیخکنی کی ـ ہمارے شہدا جنت میں ہیں (جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کیے گئے انھیں ہرگز مردہ نہ سمجھو (بلکہ) زندہ ہیں ـ اپنے پروردگار کے پاس سے روزی پاتے ہیں ـ
(پ۴ ـــ ۱۶۹ آل عمران ۳)

قیامت میں اُسے معلوم ہوگا جس نے تجھے اس جگہ پر بٹھایا کہ کس کا ٹھکانا بُرا ہے اور کس کے مددگار کمزور ہیں ـ جبکہ قاضی اللہ ہوگا ـ اور مدعی رسول ہوں گے اور تیرے اعضا تیرے خلاف گواہی دیں گے ـــــ اے دشمن خدا تجھ سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتی ہوں ـ آنکھیں اشکبار ہیں ـ دل جل رہا ہے ـــــ ہماری بے حرمتی کے صلہ میں اللہ کے خزانے سے شیاطین کا گروہ سفیہوں کے گروہ سے صلہ کا امیدوار ہے ـ

اگر تو نے (آج بظاہر ہمارے قتل سے) فائدہ اٹھا لیا ہے تو اس سے اس وقت نقصان اُٹھانا پڑے گا جب سوا تیرے عمل کے تیرے پاس کچھ بھی نہ ہوگا ـ تو ابن مرجانہ (ابن زیاد) کو پکارے گا اور وہ تجھے پکارے گا ـ میں صرف اللہ سے شکایت کرتی ہوں ـ تجھے جو کچھ کرنا ہے کر، تجھ پر عار کا یہ داغ کبھی تیرے دامن سے نہ چھٹ سکے گا ـــــ خدا کی حمد کہ اس نے سعادت اور مغفرت کو سرداران جوانان جنت کا انجام قرار دیا اور انھیں جنت میں جگہ دی ـــــ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ ان کے درجے اپنے کرم و مزید فضل سے ان کو نوازے ؟ ۷۵ دائرۂ معارف قرن عشرین

ذلت و عزت اور موجودہ زندگی اور آخرت کے متعلق اور جزا و سزا کے مسائل پر خاتون کربلا کے اس برجستہ خطبہ سے جو روشنی پڑتی ہے اس پر پاکیزہ رسولوں اور حق آگاہ لوگوں کی ہمیشہ نظر رہی ہے اور ذہن و روحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ روز بروز اس کے جوہر کھلتے رہیں گے ـ اس دربار میں ایک اور واقعہ پیش آگیا جس میں خاتون کربلا کی شہامت و بزرگی کا اظہار ہوا ـــــ ایک نافہم شامی نے (معاذ اللہ) فاطمہ بنت الحسین کو کنیزی کے لیے یزید سے مانگا ـــــ خاتون کربلا نے فرمایا ـ تو جھوٹا ہے تو نے کمینہ پن کی بات کی ـ یہ حق نہ تجھے ہے نہ خود یزید کو ہے ـ خاتون کربلا نے جس بے باکانہ انداز میں اُسے جھڑکا اس سے یزید کے نفسیات پیچیدہ ہوگئے ـ اس نے کہا خدا کی قسم مجھے یہ حق ہے اگر میں کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں خاتون کربلا نے فرمایا ہرگز نہیں، اللہ نے تجھے یہ حق نہیں دیا ہے ـ

اس وقت تو ایسا کرسکتا ہے کہ ہماری ملت سے نکل جائے اور ہمارے دین کے علاوہ کسی اور دین کو اختیار کرلے۔ اشتعال و شکست کی ملی جلی کیفیت اس پر طاری ہوئی وہ شعلہ کی طرح بھڑکا اور بجھ گیا۔ کہنے لگا تم مجھ سے اس طرح باتیں کرتی ہو۔ (معاذ اللہ) دین سے نکلے تمہارے باپ اور بھائی۔ خاتون کربلا نے کہا۔ اللہ کے دین اور میرے باپ اور بھائی اور نانا کے دین سے تو نے تیرے باپ نے اور دادا نے ہدایت پائی ہے۔ یزید نے کہا (معاذ اللہ) اے دشمن خدا تم جھوٹ بول رہی ہو ——
خاتون کربلا نے فرمایا تم حاکم ہو اور ظلم سے گالی دیتے ہو اور اپنے اقتدار سے دباتے ہو۔ اس پر یزید جھینپ گیا (سہیلی تاریخ کامل ابن اثیر) جانباز قیدی قید خانہ میں ڈال دیئے گئے انقلاب کے کوہ آتش فشاں سے دھواں اٹھنے لگا ملک کے مختلف حصوں میں واقعہ شہادت سے بیداری و جرأت و ہمت پیدا ہوئی یزید پر تنقید یں ہونے لگیں اس سے یزید پریشان ہو گیا۔ اس نے اہل حرم کی رہائی کا اعلان کیا۔ لیکن خاتون کربلا نے دمشق میں مزید چند دن قیام کی خواہش کی تاکہ آزادی کے ساتھ دشمن کے دارالسلطنت میں سید الشہدا اور کشتگان راہ خدا کا غم منالیں۔ خاتون کربلا نے کئی روز مجلس غم برپا کی جس میں دمشق کی عورتوں نے شرکت کی۔ ذہن بدلے۔ حقیقت سے پردے ہٹے۔
خاتون کربلا ہی کی فرمائش پر یہ قافلہ کربلا ہوتے ہوئے مدینہ چلا۔ کربلا میں کتنے روز قیام رہا۔ بھائی کی قبر سے آخری بار بہن رخصت ہو کر مدینہ آئی اور ساری زندگی بھائی کے نصب العین کی اشاعت کے لیے وقف کر دی جس طرح اللہ نے اپنا دین نازل کیا اور سرور انبیا نے اس کی اشاعت کی اور سید الشہدا نے اسے حیات تازہ بخشی اسی طرح خاتون کربلا نے سید الشہدا کے کارنامہ کو زندہ رکھا۔ پھیلایا۔ اس کی تشریح کی۔ اور تاریخ کو اس کا امین بنا دیا۔

۱۲ ——

تاریخ و سیرت و رجال و خلافت کے مصنف جب جب اس عہد کی تاریخ چھیڑتے رہے ہیں تو خاتون کربلا کی عقل و فہم و ہمت نے ان کو شدت سے متاثر کیا ہے —— عرصہ دراز سے خاتون کربلا پر مستقل کتابوں میں اور تاریخ کربلا کے ضمن میں اور صدر اول کی مسلمان خواتین کے ذیل میں اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔
نظم و نثر میں ادیبوں۔ مورخوں۔ شاعروں کے ذہن عظمت بنت علیؑ کی پر عقیدت سے موتی لٹاتے رہے ہیں۔
ابو الحسن یحییٰ بن حسن عقیقی عبیدلی م ۲۷۷ھ؁ نے اخبار الزینبیات[۱] ایک کتاب لکھی جس میں ان خواتین پر تاریخی مواد مہیا کیا جن کے نام زینب تھے۔ اس سلسلے میں عبیدی نے خاتون کربلا پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ عربی و فارسی اردو و انگریزی میں چھوٹے بڑے رسالے خاتون کربلا پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔
ابن طولون نے الرسالۃ الزینبیہ لکھا۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے رسالہ زینبیہ لکھا جس قاسم مصری مدیر رسالہ ہدی الاسلام نے رسالہ سیدہ زینب" لکھا۔ ان کے علاوہ مصریوں نے مختلف اوقات میں بہت سے رسالے شائع کئے۔ عصر قریب میں ایک قابل توجہ کتاب فاضل نجف شیخ جعفر نقدی مرحوم نے زینب کبریٰ لکھا۔
چار پانچ سال ہوئے ڈاکٹر بنت الشاطی مصری مشہور خاتون نے "بطلہ کربلا" کتاب لکھی جس کا ترجمہ میری نگرانی میں خان بہادر سید محمد سبطین صاحب نے کیا جس کا ایک اڈیشن ادارہ سرفراز نے شائع کیا اور دوسرا اڈیشن امامیہ مشن لاہور نے شائع کیا ہے۔ انگریزی میں محمد ساطین صاحب نے بمبئی سے ایک کتاب شائع کی۔ فارسی میں عباس علی خان مستوفی فرزند صاحب ناسخ نے طراز مذہب لکھی تھی۔ بطلہ کربلا ڈاکٹر بنت الشاطی کے دو ترجمے بھی فارسی میں شائع ہو گئے ہیں۔ دو ایک کتابیں عہد حاضر میں دوسرے مصنفوں کی لکھی ایران میں شائع ہوئی ہیں۔
اردو میں بھی کئی کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں۔ صادق حسین صاحب بی اے مرحوم کی کتاب ثانی زہرا ایک ستجب وہ کتاب ہے۔ ابھی ابھی امامیہ مشن لکھنؤ نے ایک کتابچہ خاتون کربلا کرمہ صالحہ عابدی ساحبہ کا شائع کیا ہے جو ہمارا حس و سادگی و عقیدت کی گرم جوشی سے پر ہے۔
اس طرح اخبار سرفراز لکھنؤ نے خاتون کربلا پر غور و فکر کے دروازے وا کیا ہے۔ ایک مخصوص نمبر ثانی زہرا پر شائع کیا —— اب سرفراز ہی کے ذریعہ سے رسالہ خاتون کربلا ایک مخصوص نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ کی تصنیف کا فخر ہمارے روحانی فرزند تابش پر تھا

——

[۱] مطبوعہ ہے، یہ کتاب بھی ہے بشرطیکہ تو مسلم بھی ہو۔

صاحب ایم اے فلاسفی علیگ بن جناب محمد نقی رضا صاحب بدایونی کو حاصل ہے۔ جعفر رضا اگرچہ کم عمر ہیں لیکن ان کے خیالات اور محنت کو دیکھتے ہوئے اُن کے متعلق روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

ان کو بچپن سے علوم جدیدہ اور دینی علوم کا ماحول ملا۔ ان کی ذہنی تربیت اس طرح ہوئی کہ وہ دینی حقائق کو منطق و عقل اور نئے علوم کی روشنی میں سلامت روی اور خلوص سے مطالعہ کرتے رہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ فلسفہ کے طالب علم ہیں اور انھوں نے فلسفہ نفسیات میں ایم اے کیا ہے بلکہ فلسفیانہ فکر کا ان کے خیالات پر غلبہ ہے ——

یہ بدایوں کی معزز فیملی سے متعلق ہیں انا ؤ اور جون پور میں ابتدا سے بی اے تک ان کی تعلیم ہوئی ۱۹۵۸ء میں مسلم یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور قانون میں ال ال بی کا امتحان پاس کیا۔

اس رسالہ میں فلسفیانہ نظر سے خاتون کربلا کی زندگی کے تاریخی حقائق کو دیکھا گیا ہے حقائق کے نفسیاتی و منطقی تجزیہ سے خاتون کربلا کے کردار کے حیرت انگیز اور قابل فخر پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

روضہ خوانوں اور مرثیہ گویوں کے غیر تاریخی مواد سے اس رسالہ میں دامن بچایا گیا ہے اور تھوڑے سے سچے واقعات پر تجزیہ و تعمق نظر سے کام لے کر اپنی بساط کے مطابق ایک قابل مسرت خدمت انجام دی ہے۔ کہیں کہیں ضعیف روایتوں کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔ مقالہ میں جذبات ہیں، مگر اسی قدر جس قدر کردار نگاری اسے ضروری سمجھتی ہے یا اجازت دیتی ہے ثانی زہرا صادق حسین صاحب مرحوم اور بطلہ کربلا میں زیادہ واقعات سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور غیر تاریخی کتابوں کو بھی مصدر میں شامل کر لیا گیا ہے لیکن اس رسالہ میں تھوڑے سے سچے واقعات پر بحث و تفحص کا عمل جاری کیا گیا ہے ابھی اس موضوع میں ترقی کی کافی گنجائش ہے اور ایسا خالص "تاریخی تشنگی ابھی باقی ہے جس میں روایت و درایت کے امتزاج سے خاتون کربلا کی سیرت کا ایک مرقع تیار کیا جائے ——

اخبار سرفراز سے امید ہے کہ ابھی وہ اس سلسلے کو جاری رکھے گا۔ اور اس موضوع پر حریق صاحب مرحوم سیتاپوری اور رزم صاحب ردولوی اور آل رضا صاحب ردولوی کے مراثی کو مخصوص نمبر میں شائع کر کے اس سلسلے کے نظم و نثر کے قابل قدر ذخیرے کو اکٹھا کرائے گا۔

دیباچہ

واقعہ کربلا پر بحمد اللہ تقریباً ہر زبان میں کافی لٹریچر مہیا ہے اور یہ موضوع کسی بھی اعتبار سے ہمیں تشنہ نہیں تھا۔ مگر خاتون کربلا کے تذکروں میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کوئی تسلی بخش تحریر موجود نہیں تھی۔ میں نے اس کتاب میں اسی کمی کو پورا کرنے کی سعی کی ہے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ فلسفہ کے جملہ تحقیقی مطالبات کو میرے اس مقالہ نے پورا کر دیا ہو۔ مگر بہر کیف اس تحریر میں ہر ممکن کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہر حقیقت اور ہر واقعہ کو نفسیات و منطق کی نظر سے دیکھا جائے۔ یہی حقائق کے تذکرہ میں عمق پیدا کر کے ثانی زہرا جناب زینب بنت علیؑ کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ ناظرین کو کرنا ہے۔ میرے لیے باعث فخر و مسرت ہوگا۔ اگر ناظرین کرام اپنے مشوروں اور تعمیری نقد سے مجھے نوازیں تاکہ اس سلسلے کی آئندہ اشاعتوں میں تجویز کردہ نقائص کی طرف پوری توجہ کی جا سکے۔

یہ کتاب نہ تاریخ ہے جس میں تفصیل اور واقعات کی ترتیب وغیرہ پر زور دیا جاتا اور نہ ذاکری کی کتاب ہے جس میں "آل مجلس" پر توجہ کی جاتی۔ یہ صرف ایک تنقیدی مقالہ ہے جس میں نقد و نظر کے ساتھ ایک شخصیت کے کردار کو پرکھنا مقصود ہے اور یہ تنقیدی نظر بھی مخصوص طور پر فلسفیانہ —— یعنی منطقی اور نفسیاتی —— طرز فکر کے ساتھ ہے۔ کردار کے مختلف خصوصیات اور پہلوؤں کو روشن کرنے کے لیے تاریخی واقعات پر نظر کی گئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان واقعات کا ذکر بھی اصل مقصد ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین سے استدعا ہے کہ واقعات کے ذکر پر زیادہ توجہ نہ فرمائیں بلکہ یہ غور کریں کہ ان واقعات کے فلسفیانہ تجزیہ سے بنت علیؑ کے کردار کے تمام عناصر واضح ہو سکے یا نہیں۔

واقعات کی نفسیاتی اور منطقی تشریحات یا عقلی توجیہات میں ممکن ہے نامعلوم طریقہ پر میرے جذبات شامل ہو گئے ہوں تاہم کسی حد تک تو فن کردار نگاری کے مطابق کردار نگار کو جز باتی رنگ بھرنے کا حق ہوتا ہی ہے اور اس اصول کے ماتحت میں قابل معافی ہوں۔ ہاں اصولاً اس کا پورا لحاظ ضروری ہے کہ مصنف کے جذبات حقائق کو ناقابل شکل نہ بنا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری تحریر میں یہ نقص نہیں پیدا ہوا ہے۔

خاتون کربلا حضرت زینب بنت علیؑ کے کردار پر یہ پہلا مقالہ حاضر ہے۔ انشاء اللہ اس سلسلے کے دوسرے حصے بھی عنقریب پیش ہو جائیں گے۔

اپنے بزرگ و مشفق سرکار رئیس المحققین ڈاکٹر سید نجفی حسن صاحب کا منہ بولی پی ایچ ڈی (الازہر) کی نوازشوں کا میں بے حد ممنون ہوں جن کی بزرگانہ ہدایتیں زیر تصنیف "خاتون کربلا جلد اول" کی تصنیف میں بلکہ میری ہر فکر میں ہمیشہ معین و مددگار ثابت ہوتی رہی ہیں۔ والسلام

مہتاب جعفر رضا عفی عنہ

بابِ اوّل

تمہید

فاطمۃ سیدۃ نساء العالمین ۔ (ارشادِ رسولؐ)

(یعنی فاطمہؑ تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں)

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول اور اس ضمن کی متعدد دیگر احادیث حضرت زینبؑ بنتِ علیؑ کی والدہ ماجدہ کی عصمت و طہارت اور افضلیت و برتری پر مہرِ تصدیق ہیں۔ نبی اکرمؐ کا واضح ارشاد ہے کہ حضرت فاطمہؑ خواتینِ عالم کی سردار ہیں۔ ثانیِ زہراؑ کے کردار پر مفصل بحث سے قبل ضروری ہے کہ اس منبعِ عصمت و طہارت کی پاک شخصیت پر قدرے توجہ کی جائے جس کے خون سے زینبؑ و حسینؑ کے پاک جسموں کی تعمیر ہوئی تھی اور جن کی آغوشِ تربیت میں کربلا کی تاریخ کے یہ بلند کردار ڈھلے تھے۔

حضرت رسولِ کریمؐ نے اپنی بیٹی کو سیدۃ النساء اور خاتونِ جنت کی عورتوں کا سردار کہا مگر اکثر عالمین کی عورتوں کی سرداری سے سرفراز فرمایا۔ سرداری کیا ہے اور سردار کسے کہتے ہیں اس کی تفصیل کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ کسی بھی سردار کا ان تمام افراد سے افضل و ممتاز ہونا لازمی ہے جن کے اوپر اس فردِ خاص کو سردار مقرر کیا گیا ہو مگر باوجود اس عام اصول کے دنیاوی اور دینی اعتبار سے سردار کے نظریہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دنیاوی سردار پہلے مقرر ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ اب سردار بنا دیا گیا اس لیے از روئے نظم (DESCIPLINE) دیگر اشخاص پر اس کا احترام عہدہ کی پاسداری میں لازمی ہو جاتا ہے۔ اب کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ عہدہ نااہل کے ہاتھ میں پہنچ جائے کیونکہ عہدہ دینے والوں کا شعورِ تصفیہ خود ناقص ہوتا ہے۔ اس قسم کے غلط انتخاب پر دنیاوی معیارِ نظم یہ ہوتا ہے کہ غلط انتخاب کی بھی بہر حال لاج رکھی جائے اور منتخب شدہ عہدہ دار کو اس عہدہ کے لیے موزوں تسلیم کرتے ہوئے حسبِ حال اس کی عزت کی جائے مگر اللہ کے منصف دربار میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں عہدہ دینے سے قبل اللہ کا رسولؐ عہدہ دار کی صلاحیتوں کا جائزہ لیتا ہے اور شعورِ رسالت عہدہ لینے والے کو خوب خوب پرکھتا ہے۔ قدرت و رسالت کا یہ طرز ہر عہدہ کے لیے یکساں طور پر

۱؎ الفاطمۃ بضعۃ منی۔ (فاطمہؑ میرا ایک حصہ ہے)

۲؎ فاطمۃ سیدۃ نساء اھل الجنۃ

(فاطمہؑ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں) ۔ وغیرہ

بنتا جاتا ہو، چاہے خلیل کی خلّت ہو خواہ موسیٰ کا کلیم ہونا چاہے نبیؐ کی نبوت ہو اور چاہے اس کے نائب کا ولی ہونا وغیرہ۔

چنانچہ ہم کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ سیدۂ عالم کو سرداری بخشتے وقت بھی خدا کے رسولؐ نے رسالت کی تمام ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت فاطمہؑ کی شخصیت کا پوری طرح جائزہ لیا ہوگا اور اس کے بعد یہ لقب بخشا ہوگا۔ دینی عہدہ داری کا جو اصول ابھی بیان کیا گیا اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تصور معاذ اللہ مناسب نہیں کہ حضرت پیغمبرؐ بیٹی کی محبت یا اور کسی وقتی جذبہ میں حضرت فاطمہؑ کی تعریف کر گئے۔ اگر ہم کو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے شعور رسالت پر بھروسہ ہے (جو ایمان کی دیگر منازل کے لئے بے حد ضروری ہو) تو یہ ماننا پڑے گا کہ سیدۂ عالم کی شخصیت از خود قابل ستائش اور قابل احترام ہے اور موصوفہ کی شخصیت کی اس بے پناہ صلاحیت نے ہی حضرت ختمی مرتبت کے ذمہ دارانہ شعور کو مجبور کیا تھا کہ وہ موصوفہ کو سرداری کا لقب بخش دیں۔ المختصر دہن رسالت سے نکلی ہوئی یہ لفظیں بہانگ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ حضرت فاطمہؑ کی ذات مرجع ہے ان تمام صفات حمیدہ کا جو اسلامی معیار کے اعتبار سے با اصول عورت میں پائی جانی چاہئیں اور اس لحاظ سے ان کو دنیا کی تمام عورتوں پر ویسی ہی فوقیت حاصل ہو جیسی کسی سردار کو اپنے قبیلہ پر ہوتی ہو۔

دنیاوی اور دینی عہدہ دار میں ایک دوسرا بنیادی فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ دنیاوی عہدہ دار بہ جبر فرائض انجام دیتا ہے اور اس کا بھی امکان ہو کہ فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کر جائے۔ مگر دینی عہدہ دار کے یہاں اس طرح کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اس کی تو مکمل زندگی اپنے فرائض کی تکمیل میں صرف ہوتی ہے۔ دراصل یہ دوسرا فرق بھی پہلے ہی فرق کا نتیجہ ہے یعنی یہ کہ دنیاوی عہدہ صلاحیتوں کا جائزہ لے کر نہیں دیا جاتا کیونکہ عہدہ دینے والے کی صلاحیت جائزہ از خود ناقص ہوتی ہو اس لئے چاہے کتنی ہی ایمانداری سے کام لیا جائے اس بات کا برابر امکان ہو کہ عہدہ دار کا انتخاب غلط ہو جائے مگر دینی عہدہ دینے والا ——— یعنی خدا یا اس کا نبیؐ ——— کامل و اکمل ہے۔ نتیجۃً عہدہ دار بھی نقص سے پاک منتخب ہوتا ہے چونکہ عہدہ دار ایسا ہوتا ہے اسی لئے اس کے کردار میں ہمہ وقت متعلقہ فرائض کا عکس نظر آیا کرتا ہے اور کسی وقت بھی وہ فرض سے پیچھے ہٹ ہی نہیں سکتا۔

مندرجہ بالا تمہید کی روشنی میں حدیث رسولؐ کا مطلب یہ نکلا کہ حضرت فاطمہؑ بنت رسولؐ کی ذات میں بحیثیت سردار کے اعلیٰ ترین صفات نسوانی تھے۔ ان کی زندگی ایک بہترین اور افضل ترین عورت کا مثالی مرقع تھی۔ اس کے علاوہ دوسری یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہو کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اپنے منصب سے متعلق فرائض کی انجام دہی میں صرف ہوا۔ ان کی پوری زندگی ——— (جس قدر بھی تاریخ کی تاریکی سے چھن کر ہم تک اس کے حالات پہنچ سکے ہیں) مکمل ہدایت ہے۔ باپ بیٹے، بیٹی، شوہر اور دیگر متعلق لوگوں کے ساتھ کسی عورت کے کیا فرائض و آداب اسلامی معیار کے اعتبار سے ہونا چاہئیں، اس کا عملی مرقع سیدہ کی زندگی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حدیث رسولؐ کا تجزیہ یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ حضرت فاطمہؑ بنت رسولؐ نہ صرف اپنے دور کی بلکہ گزشتہ و آئندہ تمام عورتوں کی سردار بنائی گئی ہیں۔ نہ صرف اس عالم آب و گل کی بلکہ ان لاتعداد عالمین کی عورتوں پر انھیں سرداری بخشی گئی جن کا انسان ابھی شمار بھی نہیں کر سکا ہے۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ آسیہ سارہ، مریم اور خدیجہ جیسی بزرگ عورتیں سب کی سب فاطمہ بنت رسولؐ کی سرداری میں تھیں۔ عقل کا تقاضہ ہے کہ اتنی بلند مرتبہ شخصیت غیر معصوم ہو ہی کیونکر سکتی تھی لہٰذا عقلی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ سیدۂ عالمؑ عصمت کاملہ کی حامل تھیں۔

یہاں پر حضرت فاطمہؑ کے فضائل کا مفصل بیان مقصود نہیں ہے بلکہ دکھانا یہ ہے کہ یہ ایک واحد ذات تھی جس کی پیروی صنف نسواں کی لاتعداد فردوں پر واجب قرار دی گئی۔ اس شخصیت کی بھی بڑی نازک منزل تھی کہ ہر عورت کے لیے اتنا واحد شخصیت کو نمونۂ عمل بننا تھا۔ یہاں پر ایک منطقی دقت یہ

محسوس ہوتی ہے کہ حضرت سیدہ کی آج سے تیرہ سو سال قبل صرف اٹھارہ برس کی مختصر عمر کیونکر آج دور جدید میں طویل عمر والی مختلف ماحول میں رہنے والی عورتوں کے لیے قابل تاسی ہو سکتی ہے۔ یہ تو ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کوئی بھی نمونہ جو بشری حدود اور مکان و زمان کی حدود کے اندر پیش کیا جا رہا ہے کسی طرح سے بھی جزوی اور تفصیلی طور پر قابل تاسی ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل نمونہ عمل کے معنی یہی یہ ہیں کہ بنیادی کلیات و اقدار (BASIC PRACTICAL VALVES) بطور نمونہ پیش کر دیئے جائیں اور صاحبان عقل مختلف زمانوں میں اور مختلف ماحول میں اس بنیادی نمونہ کو سامنے رکھ کر اس سے مطابقت کر کے اپنے عمل کی جانچ کرتے رہیں۔ چنانچہ ایسا ہی جناب فاطمہؑ کے معاملہ میں بھی ہے' یہاں نسوانی حیات کا بنیادی نمونہ موجود ہے جس سے کسی فرد کا اتفاق مثالی سمجھا جائے گا اور تضاد غیر مثالی۔ یہ امید کرنا کہ جزوی طور پر کسی بھی زمانہ اور ماحول میں "ممکن عمل" (POSSIBLE CONDUCT) کی جزوی مثال (PARTICULAR EXAMPLE) اس نمونہ کے کردار میں ہونا چاہیئے یقیناً منطقی حماقت ہوگی۔ جیسا ابھی واضح کیا گیا یہ تو حد امکان سے ہی بعید ہے' ہاں کوئی بھی منطقی یا نقاد یہ حق رکھتا ہے کہ حضرت سیدہؑ کی زندگی کا اور انکے کردار کا جائزہ لے اور دیکھے جائے کہ کوئی چھوٹا سا عمل بھی کہیں مثالی کردار کے خلاف تو نہیں ہو یا ان کا کردار اسلامی معیار کا اعلیٰ ترین نمونہ ہو یا نہیں اگر ان کی زندگی میں معاذ اللہ کوئی عمل ایسا نظر آجائے تو وہ حق رکھتا ہے کہ سیدہؑ کی سرداری چھین لے بلکہ علم منطق کی قدر کرتے ہوئے ہم یہ بھی جسارت کرتے ہیں کہ اس کو رسولؐ کی رسالت سے انکار کرنے کا حق دے دیں مگر لا واللہ ایسا ہرگز ہو ہی نہیں سکتا۔ دوست تو دوست دشمن کی تاریخیں جھوٹی روایت بھی اس قسم کی پیش نہیں کر پائیں۔ پس اب ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ سیدہ عالمؑ تمام عورتوں کے لیئے مثالی عورت تھیں اور ان سب کی سردار تھیں۔

اوپر کی سطروں میں منطقی حقیقت کے طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ فاطمہ بنت رسولؐ کی مختصر زندگی نسوانی زندگی کے ہر پہلو کو تفصیلاً پیش کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ان کا کردار تو صرف بنیادی اور اجمالی طور پر معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب لا محالہ عقل صنف نسواں کی کچھ ایسی فردیں تلاش کرتی ہے جو نسوانی زندگی کے مختلف مخصوص پہلوؤں کو اپنے کردار میں تفصیلاً مکمل طور پر معیار کے نقطۂ کمال کے ساتھ پیش کر سکی ہوں۔ تاریخ کے صفحات یقیناً ایسی ہستیوں کو پیش کر سکیں گے جنھوں نے نازک اوقات میں اچھی ماں ہونے کا ثبوت دیا۔ بہن کی حیثیت سے ایک معیار پیش کیا۔ جنگ کے مجروح مجاہدوں کی مرہم پٹی کی' عبادت و ریاضت میں رابعہ کا ثانی' بکردار شوہروں کا کردار بنایا' ماں باپ کی اطاعت کا نمونہ پیش کیا وغیرہ۔ گو کہ یہ سب فاطمہؑ کی سرداری کے ماتحت ہوں گی مگر پھر بھی اپنے مقام پر فضیلت اور شرف کی یقیناً مالک سمجھی جائیں گی۔ یہاں پر ہم تاریخ اسلام سے ایک ایسی معظمہ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو بڑے نازک حالات میں نسوانی حیات کے نہ معلوم کتنے پہلو روشن کر سکیں۔ چاہتے ہم یہ ہیں کہ مفصل بتائیں یہ معظمہ کون تھیں۔ کیا تھیں اور کیسی تھیں مگر پہلے ہی اپنی کم مائیگی کا اعلان کیئے دیتے ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ ہمارا قلم موصوفہ کے کردار اور ان کی شخصیت کا مکمل احاطہ کر ہی لے گا۔ بہر کیف کوشش یہی ہے۔ آثار کی بنا پر ہم اتنا کہنے کے لیئے تو مجبور ہیں کہ وہ بشری حیات کی تمام پابندیوں کے ساتھ انسانی جامہ میں بظاہر ایک عورت تھیں۔ مگر اس کے بعد وہ کیسی عورت تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جائے۔ معصوم لکھتے ہوئے قلم رکتا ہے کیونکہ نصوص سے عصمت صرف چودہ معصومین کی مخصوص معلوم ہوتی ہے۔ بس اس کے علاوہ جتنے بھی کمالات اور اوصاف حمیدہ احاطہ امکان میں ہیں وہ سب نسائیت کی اس فرد کامل کے ساتھ متعلق کر دیجیئے۔ ان معظمہ کو مورخوں نے کبھی ثانی زہراؑ کہا۔ کبھی فخر حوا۔ ویسے ان کا اصل نام حضرت زینبؑ بنت علیؑ (صلوٰۃ اللہ علیہا) ہے۔ ہمارا منشاء یہی ہے کہ اس مضمون میں علیؑ کی لاڈلی اور سیدہؑ کی پیاری بیٹی کے اعلیٰ کردار کی ایک جھلک اپنے ناظرین کے سامنے پیش کریں۔

یقیناً جناب فاطمہؑ بنت محمدؐ کا کردار بہ حیثیت سردار کے کچھ عملی قدروں (PRACTICAL VALUES) کو پیش کر سکا تھا۔ مگر ان کی بیٹی نے نسوانی قدروں کو بڑے نازک ماحول میں عملی طور پر پیش کیا اور عملاً بتا یا کہ عورت کیونکر دین کو

بچاتی ہے کیسے ظلم سے ٹکر لیتی ہو اور کراہتی ہوئی انسانیت کی کس طرح محافظ بنتی ہو۔ ان کے کردار میں حضرت فاطمہ زہراؑ کے کردار سے بنیادی تضاد بالکل نہ تھا بلکہ مکمل اتفاق تھا۔ حضرت زینبؑ کے عمل میں مزید خوبی یہ بھی تھی کہ ان کی زندگی عمل کی نازک ترین اور دشوار ترین وادیوں سے گزری جہاں بالعموم نہ صرف حیات نسوانی بلکہ حیات انسانی دم توڑ دیتا ہے۔ تاریخ نے حضرت فاطمہ کی تکمیلی شخصیتیں (SUPPLEMENTARY PERSONALTIES) بہت سی پیدا کی ہوں گی مگر اس وقت ثانی زہراؑ کی شخصیت ہمارے فکر کا موضوع دو وجہوں سے بنی ہوئی ہے۔ اول تو کسی دوسری فرد نے انسانی زندگی کے اس قدر زیادہ پہلوؤں کو روشن نہیں کیا اور دوسرے ان معظمہ نے جس قدر نازک حالات اور مشکل ماحول میں عمل کے نمونے پیش کیے ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ویسے مشکل حالات میں کوئی عورت عمل کا ایسا اونچا معیار پیش نہ کر سکی۔ ثانی زہراؑ حضرت زینبؑ بنت علیؑ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے قابل تاسی ہے ہمیں اس سے بحث نہیں۔ فی الحال ان کی شخصیت کی تحلیل (ANALYSIS) اور ان کے کردار کا ذکر مقصود ہے تاکہ ظاہر ہو سکے کہ خانوادۂ رسالت کی یہ فرد جو کردار پیش کر گئیں جو عموماً یا خصوصاً کسی دوسرے خاندان میں فطرت انسانی کی حدود میں رہتے ہوئے کوئی فرد پیش نہ کر سکی۔ ذیل میں ثانی زہراؑ کی زندگی کے مختلف پہلو ان کے کردار کے مختلف عناصر اور ان کی ذمہ دارانہ شخصیت اور بے مثل کارناموں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

باب دوم

کردار زینبؑ پر لمحۂ فکریہ

زینب بنت علیؑ کے کردار پر قلم اٹھاتے وقت کردار سازی کا جو حق ہے وہ ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ تاریخ ان کی زندگی کے بہت کم واقعات فراہم کر سکی ہے پھر بھی جناب زینبؑ کے کردار کی رفعت اور ان کے نفس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے آپ کا وہ ذمہ دارانہ رول ہی کیا کم ہے جو آپ نے کربلا کے سانحہ عظیم میں ادا کیا۔ روایات کی روشنی میں کچھ ایسا پتہ چلتا ہے کہ حضرت زینبؑ کی خلقت کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کربلا کی تکمیل کر دیں۔ حضرت زینبؑ کے عمل کا ایک سلسلہ جو مدینہ سے کربلا اور پھر کربلا سے کوفہ و شام ہوتا ہوا پھر مدینہ پر ختم ہوتا ہے۔ پس ہم اپنے زاویۂ فکر کو صرف انہیں واقعات تک محدود کیے دیتے ہیں جو اس دوران میں معظمہ سے متعلق رہے ہیں۔

کربلا اور اس سے متعلق مقامات پر جناب زینبؑ نے جس ثابت قدمی اور خوش اسلوبی سے اعمال کو انجام دیا ہے اس سے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ گویا وہ ان تمام حالات کا مفصل علم رکھتی تھیں اور ان میں سے ہر مرحلہ کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آئی تھیں۔ نانا نے وحی الٰہی سے یہ سب … پہلے ہی گھر میں بیان ہوتا تھا اور واقعہ کربلا سے متعلق بہت سی باتیں انہیں ذریعہ سے ان کے علم میں آئی ہوں گی۔ علاوہ اس کے کربلا کی کسی بھی مصیبت کی اطلاع یا تو کچھ دیر قبل امام حسین علیہ السلام سے ان کو مل جاتی تھی یا حالات سے وہ خود اندازہ لگا لیتی تھیں مگر مصیبت کی کیا حیثیت ہو گی اور کس وقت کیا کام خاص ہو گا یہ سب کچھ حضرت زینبؑ کے اپنے شعور کو پتہ چل جاتا تھا۔ مگر تاریخ پڑھنے والوں سے یہ پوشیدہ نہیں کہ جناب زینبؑ نے واقعۂ کربلا کے سلسلے کی ہر مصیبت کا اس طرح مقابلہ کر کے دکھایا جیسے وہ اس کی ماہیت اور حیثیت تک سے واقف تھیں۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ مصیبت کا علم جتنا پہلے سے ہوتا ہے انسان اس کے لئے اسی قدر تیار ہو جاتا ہے اور نتیجۃً عمل میں اسی قدر استقامت اور استقلال آ جاتا ہے یعنی اگر برابر صلاحیتیں رکھنے والے دو اشخاص ہیں۔ ایک باخبر

دوسرا یہ کہ باخبر شخص مصیبت کے وقت زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔ کردار سے زینبؑ بنت علیؑ کو آپ اگرچہ حالات کی جزوی تفصیلات سے باخبر نہیں تھیں پھر بھی ہر مصیبت میں بے پایاں کردار پیش کیا۔ دراصل یہ اس گھرانے کی تربیت کا اثر تھا۔ ماں اور باپ کی تربیت نے ان کے شعور کو سیسہ کی طرح پختہ اور فولاد کی مانند مضبوط کر دیا تھا۔ منطقی اور عقلی طور پر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ماں باپ کی مصیبتوں کے تجربہ نے شاید کسی حد تک عادی بنا دیا ہوگا۔ مثلاً باپ کے گلے میں بندھی ہوئی رسی دیکھ چکی تھیں[۱] اس لئے اپنی رسی زیادہ گراں نہ گزری ہو۔ لیکن ہم یہ تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں۔ اول تو یہ کہ حضرت زینبؑ کی مصیبتیں جناب سیدہؑ اور علیؑ کی مصیبتوں سے بدرجہا زیادہ اور شدید تھیں اس لئے معظمہ کا گزشتہ تجربہ عظیم تر مصائب کے برداشت کرنے کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اور پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت زینبؑ کی عمر کا وہ غیر شعوری حصہ تھا جس میں ماں باپ پر مصائب گزرے۔ جب حضرت زینبؑ شعوری عمر کو پہونچیں تو ان کے والد بزرگوار کے حالات زیادہ سے زیادہ سازگار ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ جو کردار حضرت زینبؑ بنت علیؑ نے کربلا میں نیز شہادت عظمیٰ کے بعد پیش کیا وہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ان کو قدرت نے صلاحیتوں کا ایک خزانہ دے دیا تھا اور نہیں پھر قدرت کو اطمینان —— بلکہ ناز —— تھا کہ یہ شخصیت اپنی ہر ذمہ داری کو سنبھال لے گی۔ یہ ذات ہر مصیبت کو برداشت کر سکے گی اور نازک ترین حالات میں عمل کا معیار پیش کر دے گی اور یہ علی علیہ السلام کی تربیت تھی جس نے زینب علیہا الصلوٰۃ والسلام کی صلاحیتوں کو نکھار دیا تھا۔ حقیقت میں ایسا ہی ہوا تھی۔ کوئی مصیبت انسانی مدارج بھی جو حضرت زینبؑ پر وارد نہ کی گئی اور کوئی شعوری کا پہلو باقی رہ گیا جس کا مظاہرہ حضرت زینبؑ کے کردار نے اس مصیبت میں نہ کیا۔

[۱] مثلاً دیکھئے "شہید انسانیت" مصنفہ مولانا السید علی نقی صاحب قبلہ۔ صفحہ ۶۵۵ سطر ۱۳

ہاں ہم حد سے حد اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انسانی نظر تنقید کو عادی بنانے کے لئے قبل کربلا کچھ ایسے واقعات قدرت نے رونما کر دیئے تھے جن کی بنا پر یہ سمجھنا آسان ہو جائے کہ حضرت زینبؑ کا شعور مصائب سے نا آشنا نہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور کربلا کا واقعہ اپنی حیثیت و نوعیت کا پہلا حادثہ ہوتا تو یقیناً تنقید کی عام نگاہ حضرت زینبؑ کو مافوق البشر کہہ دیتی۔ مگر قدرت ایسا نہیں چاہتی تھی۔ قدرت تو بشری کردار کی ہی اعلیٰ ترین مثال پیش کرنا چاہتی تھی جسے اس نے زینبؑ بنت علیؑ کی شکل میں پیش کر دیا۔

حضرت زینبؑ بنت علیؑ نے کربلا میں جو کردار پیش کیا ہو اس پر صنف نسواں جتنا ناز کرے نوع انسانی جتنا فخر کرے وہ کم ہے۔ ان کی جگہ اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو ان مصائب میں دو صورتیں ممکن تھیں یا تو معصوم بالذات ہوتی اور مصائب برداشت کرنے کے لئے لامحدود صلاحیتوں کی مالک۔ اگر معصوم نہ ہوتی جیسا حضرت زینبؑ کے سلسلے میں بھی کہا جا سکتا ہے —— تو پھر چند دیگر صورتیں ممکن تھیں یا تو مصائب کی وجہ سے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتی یا مصائب سے گھبرا کر سر اطاعت خم کر دیتی۔ مگر جناب زینبؑ ایک مثالی کردار کی مالک ثابت ہوئیں۔ وہ آخر وقت تک شعور قائم رکھ سکیں۔ ظالم کے آگے ہرگز سر تسلیم خم نہیں کیا اسلامی قیود کو بہتر سے بہتر طریقہ پر نباہا اور صرف حق و صداقت کی قوت سے صرف ایمان و ضبط کی طاقت سے باطل کو شکست فاش دے سکیں۔ آپ نے ثابت کر کے دکھایا کہ نازک سے نازک حالات میں بھی ایک مسلمان عورت اپنے فرائض کیونکر انجام دیتی ہو۔

قبل اس کے کہ جناب زینبؑ بنت علیؑ کے کردار کے مختلف پہلوؤں اور ان کے مختلف اعمال کا مفصل ذکر کیا جائے چند چیزوں کا وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ اس کی روشنی میں ان کے کردار و عمل کو زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ ہمیں پہلے مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ حضرت زینبؑ کے سپرد کیا خدمت تھی کیونکہ ان کو یہ خدمت سونپی گئی تھی۔ انھوں نے اس کو کس طریقہ پر انجام دیا اس کی انجام دہی میں کیا کیا دقتیں تھیں اور پھر آخر حضرت زینبؑ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کیونکر کامیاب

ہو گئیں۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے قبل حضرت زینبؑ کی اور ان کی خدمات کی حیثیت ضمنی تھی مگر بعد شہادت حسینؑ ان کا رول کافی اہم ہو گیا تھا۔ کربلا کے آن اندوہناک حالات میں لٹے ہوئے قافلہ کی ڈھارس باندھنا لاوارث بچوں اور عورتوں کی دلجوئی کرنا، بیمار بھتیجے کا خیال کرنا وغیرہ وغیرہ ضمنی ذمہ داریوں کے ساتھ دین کے اصولوں کی حفاظت کرنا یہ تھے وہ فرائض جن کی ادائیگی پر زینبؑ کبریٰ ثانی زہراؑ مامور تھیں۔ حسین علیہ السلام تو سر دے چکے تھے اور ان کی شہادت صرف تخم ریزی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب یہ کام حضرت زینبؑ کے سپرد تھا کہ تخم کو شجر اور شجر کو ثمردار بنا دیں۔ حضرت حسینؑ تو کربلا میں ایک پیغام دے کر شہید ہو گئے تھے۔ اب یہ زینبؑ کے سپرد تھا کہ ان کی آواز حق کو بلاد اسلامی تک پہونچائیں اور اس کی صداقت عام مسلمین سے منوائیں۔ یہ کام ان کے سپرد کس نے کیا تھا تاریخ واضح طور پر نہیں بتاتی مگر انداز سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ امام علیہ السلام نے آخری رخصت پر سب [illegible] حالات سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ بہر حال اس سے زیادہ امکان بھی کیا تھا۔ مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ حضرت زینبؑ کو حالات کی تفصیل کا علم پہلے سے نہیں تھا۔ صرف اجمالی طور پر حد سے حد اتنا معلوم تھا کہ مصائب پڑیں گے اور حسینؑ کے اصولوں کی حفاظت کرنی ہوگی۔ معظمہ نے اپنے فرائض کی انجام دہی کن حالات میں کی اس کا مفصل ذکر تو ذیل کے ابواب میں آئے گا۔ ایک جملہ میں بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان مصائب پر عام انسانی قوت برداشت یقیناً دم توڑ دیتی۔ مگر امام کی ماںجائی میں چونکہ محمدیؐ، علوی اور فاطمی روح کارفرما تھی اس لئے اس نے باطل کو پسپا کر دیا، ظالم کو اپنے صبر سے مغلوب کر کے چھوڑا۔ یہ ان کے عمل کا ہی نتیجہ تھا کہ یزید کو اپنی سیاست میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا اور خود اس کے اپنے دارالحکومت میں اس کی خلافت کے خلاف آوازیں بلند ہوئیں۔ اہل بیت علیہم السلام کی حقانیت کی صدا شام کے گھروں سے بلند ہونے لگی۔ حسینیت ہمیشہ کے لیے بلند ہوئی اور یزیدیت ہمیشہ کے لیے مغلوب۔

جناب زینبؑ کی زندگی کی تقسیم

ہم جناب زینبؑ کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک تو حضرت امام حسن علیہ السلام کی شہادت سے قبل، دوسرا شہادت حسنؑ کے بعد سے شہادت حسینؑ کے قبل تک۔ تیسرا شہادت حسینؑ کے بعد سے موصوفہ کی وفات تک۔ پہلے حصہ کی زیادہ تفصیل نہ ہمارے مقصد کے لئے زیادہ مفید ہوگی اور نہ اس دور کی تفصیل تاریخ سے مل ہی سکتی ہے۔ اس دور زندگی کی ایک اہم بات بس یہ ہے کہ جناب زینبؑ کو جو باد شاہ دین و دنیا اور عوام الناس تک کے تسلیم شدہ خلیفہ وقت کی شاہزادی بنا کر رہ چکی تھیں۔ آگے موقع پر یہ بتایا جائے گا کہ شاہزادی بن کر رہنا ان کے کردار میں کیا اہمیت رکھتا ہے اور بعد کے اعمال پر اس بات کا کیا اثر ہو سکتا تھا اور ہوا۔ ناظرین پر ظاہر ہو جائے گا کہ شاہزادی بنکر رہنا بعد کو چل کر از خود بالواسطہ مصیبت کا ایک جزو تھا۔ زندگی کے اس پہلے حصہ میں حضرت زینبؑ کے شعور کو کئی مرتبہ دھچکا پہونچا تھا اور انھوں نے یقیناً اس کا کچھ اندازہ کیا ہوگا کہ باطل کس طرح حق کے لئے درپئے آزار ہوتا ہے اور حق والے حق کی کس طرح حفاظت کرتے ہیں۔ باپ کے خلاف باطل کی سرکشیاں حضرت زینبؑ نے دیکھی تھیں، بھائی حسن کے کلیجے کے ٹکڑے طشت میں گرتے دیکھے تھے۔ وغیرہ۔ ان سب حقائق کی جناب زینبؑ کے کردار میں صرف اس قدر اہمیت ہے کہ ان کا شعور حق و باطل کی اس کشمکش سے کسی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ جس کی انتہا کربلا میں آنے والی تھی۔

معظمہ کی زندگی کے دوسرے حصے یعنی امام حسین علیہ السلام کے دور امامت میں آپ کا اہم رول شروع ہوتا ہے۔ مگر اس دور کی اہمیت بھی شروع میں ضمنی رہتی ہے۔ حضرت زینبؑ کا اہم ترین رول کربلا کے میدان میں شہادت حسینؑ کے بعد آتا ہے۔ ہم ذیل کی سطروں میں موصوفہ کی زندگی کے آخری دو حصوں کا مفصل ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جناب علی مرتضیٰؑ نے آخری وقت جناب زینب کو جو وصیتیں فرمائی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام کی بصیرت نے حضرت زینبؑ کی صلاحیتوں کو یقیناً پہچان لیا تھا۔ امام کے الفاظ جناب زینبؑ کی ذمہ دار شخصیت کا پتہ دیتے ہیں۔ اس وصیت کا نمونۃً علاّمہ راشد الخیری مرحوم نے اپنی تصنیف "سیدہ کا لال" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اور یہ وہ وقت ہوگا جب دنیا کے کتے خاندان رسالت کے

خلاف دشمنوں کا ساتھ دیں گے .... زینبؑ تمہاری آزمائش کا وقت ہوگا۔ اپنی راحت اور آرام کو بھائیوں پر قربان کیجیو .... تم سب کو شامیوں اور کوفیوں میں تنہا چھوڑ رہا ہوں"

یہ فقرے مظہر ہیں کہ نظر امامت حضرت زینبؑ کے اندر کتنے ذمہ دارانہ عناصر پارہی تھی۔ یقیناً ان کے آئندہ کردار نے باپ کی امیدوں کو پورا کیا۔

حضرت امام حسینؑ اور جناب زینبؑ

امام حسینؑ جناب زینبؑ کے حقیقی بھائی تھے مگر حالات بتاتے ہیں کہ اس خونی رشتہ کے علاوہ ایک قوی تر دینی اور عملی رشتہ دونوں کے درمیان تھا اور وہ دینی تعلق یہ تھا کہ امام حسینؑ محافظ اسلام تھے اور ان کی بہن محافظ حسینیت، دین کی حفاظت کی ابتدا تو حسینؑ کے کردار سے ہوگئی۔ مگر اس کی انتہا زینبؑ کے کردار سے ہوئی۔

حضرت زینبؑ اور امام حسینؑ کے درمیان ان دو قسم کے تعلقات کا اشارہ اس لئے ضروری معلوم ہوا تاکہ حضرت زینبؑ کے کسی بھی عمل کو نہ تو صرف ایک بہن کا عمل سمجھا جائے جس میں دینی ذمہ داریاں بالکل نہ ہوں اور نہ اسے محض دینی ذمہ داریوں کی بے جبر ادائیگی سمجھا جائے جس میں خونی رشتہ کا قطعی پاس نہ ہو۔ در اصل معظمہ کا کردار تب ہی بلند ترین منزل پر پہونچتا ہے جب اس کو دونوں حیثیتوں سے دیکھا جائے۔ ہم خود اپنے تبصرہ میں برابر یہ واضح کرتے چلیں گے کہ آپ کا عمل جذبات ہمشیرگی اور احساس فرائض دونوں کے ماتحت تھا۔

باب سوئم

امام حسینؑ کی شہادت تک

واقعات کے تجزیے سے کردار نگاری

معاویہ کی سیاست کا تقاضہ یہ تھا کہ اہل بیتؑ کو بہلا پھسلا کر رام کیا جائے اور سیاسی چالوں سے حکومت کی جائے۔ مگر یزید نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی پہلی سیاسی غلطی یہ کی کہ امام حسینؑ سے کھلے لفظوں میں بیعت طلب کی۔ یزید کا یہ مطالبہ ہی شہادت امام حسینؑ کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور بہن بھائی دونوں کے امتحان کی پہلی کڑی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

امام حسینؑ کے سامنے دو راستے تھے۔ یا تو (معاذ اللہ) باطل کی بیعت کرتے یا حق کی حفاظت فرماتے۔ حضرت حسینؑ محافظ دین تھے۔ اس لئے آپ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا۔ جناب زینبؑ محافظ حسینیت تھیں اس لئے دین کی حفاظت کی خاطر امام کے ارادہ کی مؤید بن گئیں۔ حسینؑ کی ماں جائی کے نازک امتحان کا پہلا موقع وہ تھا جب بھائی نے ولید کے الفاظ گھر میں آکر دہرائے۔ یہاں پر امام حسینؑ کے علاوہ اگر کسی دوسرے شخص کی کوئی بہن ہوتی تو بھائی کی جان بچانے کے لئے ایکی سے ترکیبیں کرتی لیکن نہیں۔ اول تو زینبؑ امام حسینؑ جیسے محافظ دین کی بہن تھیں۔ اس لئے ان کی نظروں میں دنیاوی زندگی کی اتنی اہمیت ہی نہ تھی۔ دوسرے محافظ حسینیت ان کا اپنا منصب تھا اور اس اعتبار سے وہ خود بھی حفاظت دین میں امام حسینؑ کی برابر کی شریک تھیں۔ تاریخیں گواہ ہیں کہ سخت سے سخت موقع پر حضرت زینبؑ کی زبان سے ایک کلمہ بھی اس قسم کا نہیں نکلا جو امام حسینؑ کو حق پر قائم رہنے سے روکتا بلکہ جب امام حسینؑ نے حق کی حفاظت کی خاطر نانا کی لحد، بھائی کا مزار، عزیز وطن سب کچھ چھوڑا تو

بہن بھی ان کی ہر مصیبت میں ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ کوئی بھی عورت جو محبت کرنے والی بہن ہو اور صاحب اولاد ہو، نسوانیت کے اس آئیڈیل کو محسوس کر سکتی ہے جو مظاہر کے اس ایثار میں جھلکتا ہے۔ ۲۸ رجب ۶۰ھ کو زینبؑ اپنے بھائی حسینؑ یا حسینؑ اپنی بہن زینبؑ کے ساتھ اپنی مہم پر روانہ ہوگئے۔ قلم میں یارا نہیں کہ اس درد ناک منظر کو بیان کیا جا سکے جو ان مظلوم بھائی اور بہن کی رخصت کے وقت مدینہ میں ظہور میں آیا۔

پھر مکہ کی منزل آئی۔ وہاں کوفیوں کے خطوط امام کو موصول ہوئے جن میں امام کو کوفہ آنے کی دعوت دی گئی تھی اصلاح نظم کے لیے امام کو بلایا گیا تھا۔ حسین علیہ السلام نے اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو ایلچی بنا کر بھیجا۔ حضرت زینبؑ جو بھائی کی چہیتی بہن تھیں انھوں نے مسلم کی جدائی برداشت کی۔ آج پردیس میں ماں جائے کا ایک قوی ساتھی چلا گیا تھا۔ حضرت زینبؑ کے دل پر یہ ایک مصیبت تھی۔ مکہ سے رخصت ہونے کے اسباب اور پھر حج کے موقع پر روانگی حضرت زینبؑ کے دل پر کیا اثر ڈال سکی اس کا بھی اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ پورا احساس ممکن نہیں۔ یہ نبی کی نواسی اور شہنشاہ اولیاء کی شہزادی دیکھ رہی تھی کہ شارع اسلام کی یادگار کو حج سے محروم کیا جا رہا ہے یقیناً حضرت زینبؑ کو بھی صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس تھا تب ہی تو امام حسینؑ کے ساتھ وہ بھی اس امر پر تیار ہو گئیں کہ مکہ کو خیر باد کہہ دیا جائے اور خانہ خدا کی حرمت کو محفوظ کر لیا جائے۔

اسی طرح ہر منزل پر امام حسینؑ کی اس شریکۂ کار نے امام کا ساتھ دیا۔ بھائی کی ہمت افزائی کی اور ہر نازک وقت پر فرزند علیؑ کے ساتھ رہیں۔ راستہ میں اپنے بھائی مسلم کی خبر شہادت سنی۔ ان کے بچوں کو تسکین و تسلی دی اور بھائی کے غم کو برداشت کیا یہ حقائق کردار زینبؑ پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ درمیانی منازل کو ہم چھوڑتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حضرت زینبؑ نے ہر موقع پر امام برحق کا ساتھ دیا۔ حر کے لشکر سے ملاقات ہونا پھر کربلا کی طرف امام کا رخ کرنا امام کا اصحاب کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا یہ وہ باتیں تھیں جن سے حضرت زینبؑ کا جگر ہلتا اور طبیعت الجھتی ہوگی کہ نہ معلوم میرے ماں جائے پر کیا کیا مصیبتیں آنے والی ہیں مگر وہ امام کی بہن اور حسینیت کی محافظ تھیں اس نے سب کچھ برداشت کیا۔ ان کو اپنی اور امام کی صداقت پر کامل اعتماد تھا اس لئے انھیں نہ کسی مصیبت کی پروا تھی نہ موت کا ڈر۔

آخر کار حضرت زینبؑ نے دیکھا کہ امام کا مرکب دشتِ نینوا میں رک گیا اور اہل بیتؑ کے خیمے نہر علقمہ کے کنارے سے نصب کر دیئے گئے۔ حضرت زینبؑ نے مزید ظلم دیکھا کہ ابن زیاد کے حکم سے خیموں کو نہر سے ہٹا دیا گیا۔ بھائی کے صبر و ضبط کو دیکھ کر آنے والے مصائب کا تصور حضرت زینبؑ کے ذہن میں راسخ ہوتا جا رہا تھا۔ زینبؑ جیسی بہن کے لئے ایسا ہر لمحہ ایک سخت امتحان تھا کیونکہ اب ان کے ماں جائے پر سخت ترین لمحات وارد ہو رہے تھے۔ واقعات کی ترتیب اور ان کا ظہور حضرت زینبؑ کے ذہن میں باپ اور بھائی کی اجمالی پیشین گوئیاں یاد دلا رہے ہوں گے جو واقعہ کربلا کے متعلق وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائی جا چکی تھیں۔ کربلا کی تاریخیں شاہد ہیں کہ خاتون جنت کی راج دلاری اور شیر خدا کی بیٹی زینبؑ نے ایسے ثبات صبر، عزم و استقلال اور قوت و شجاعت کا عملی ثبوت دیتے ہوئے وارد ہوئیں وہ شہزادی ہی کا حصہ ہے۔

کردار زینبؑ کا ایک پہلو روشن کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ کی مدینہ سے روانگی درمیانی منازل کا طے کرنا کربلا میں وارد وغیرہ تمام مواقع پر امام کا ساتھ دینا یقیناً ارادی طور پر تھا غیر ارادی یا لاشعوری نہ تھا۔ اس طرف صرف اشارہ کافی معلوم ہوا۔ نہ تفصیل کی ضرورت ہے اور نہ اس کتاب کے صفحات کے دامن ہی میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ ایک تاریخ کی موثق حقیقت ہے جس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے کردار تب ہی بلند ہوتا ہے جب کہ عمل ارادی ہو۔

ماہ محرم سے جب برابر لشکر پر لشکر کربلا میں وارد ہو رہے تھے جن سے زمین کربلا دہلی جا رہی تھی۔ ایسا ذرا حضرت زینبؑ کے

قلب کی قوت کا اندازہ کیجیے۔ اس حالت میں ان کے قلب پر کیا گزرتی ہوگی۔ ان کے ثبات قدم اور استقلال پر ہمارے عزائم فدا کہ اب بھی حق کی حمایت میں اپنے کو پیش کیے ہوئے تھیں۔

کربلا میں ۷ محرم سے امام اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا گیا۔ نبی کی آل کو دنیا کے پیاسوں نے قدرت کی عام عطا سے محروم کر دیا تھا۔ ساقی کوثر کے بچوں پر پانی کا ایک قطرہ بھی حرام قرار دے دیا گیا تھا۔ اس مصیبت میں حضرت زینب امام علیہ السلام کے ساتھ تھیں۔ ویسے تو ہر بڑا چھوٹا اس مصیبت میں برابر کا شریک تھا مگر امام اور حضرت زینب کے ساتھ خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ذمہ بچوں کی پیاس کا خیال بھی تھا۔ یہ ذمہ داری ان دو شخصیتوں کے اوپر تھی جس میں حضرت زینب کا حصہ زیادہ تھا۔ ہم پوری احتیاط کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس مقام پر پیاسے بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری امام حسینؑ سے زیادہ حضرت زینبؑ پر تھی، اور شہادت حسین علیہ السلام سے قبل ہی چند امور میں حضرت زینبؑ پر امام حسینؑ کی بہ نسبت ذمہ داری کا بار زیادہ آ چکا تھا۔ ان اندوہناک حالات میں خانگی حالات کی ذمہ داری ان معظمہ پر تھی جو مدینہ ہی سے امام کی شریک کار بن کر چلی تھیں اور جو علیؑ کی بیٹی سیدہ کی لخت جگر اور حافظ حقیقت سبھی کچھ بیک وقت تھیں۔

آخر وہ اندوہناک اور تاریک ترین رات آئی جو امامؑ کی دنیوی زندگی کی آخری رات تھی جسے امام جیسے غیور نے مانگ کر حاصل کیا تھا۔ اس رات کی اہمیت امام اور ان کے گھر والوں کے لیے کیا تھی وہ تو تاریخ کا ایک جملہ ہی کسی حد تک ظاہر کر سکتا ہے۔ اسی رات کے متعلق تاریخیں لکھتی ہیں کہ امام حسینؑ کے خیموں سے تسبیح و تہلیل کی آوازیں اس طرح آ رہی تھیں جس طرح شہد کی مکھیوں کی آواز۔

یہ رات بھی عجیب رات تھی۔ امام علیہ السلام ان کے اعزا اور [illegible] مشغول عبادت، امام کے پردہ دار خطابیہ اور خطیبوں پر [illegible] خموشی، قاسم گلگوں قبا کے دولہے، علی اکبر [illegible] ہاشمی علمدار کی پرجوش اکڑ، انیاں، عون و محمد کے قابل داد حوصلے اسی رات میں دیکھے گئے۔ اسی رات کے واقعات سے بھی حضرت زینبؑ کے کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے اس رات جب امام نے بہن کے خیمہ میں قدم رنجہ فرمایا تو انھوں نے حضرت زینبؑ کو اپنے بچوں کو آنے والے دن کے لیے تیار کرتے ہوئے دیکھا۔ عون و محمدؑ کو یوں تعلیم دے رہی تھیں۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ کل میرا ماں جایا دشمنوں کے نرغے میں ہوگا تمھاری سعادت اسی میں ہے کہ اپنی جانیں اپنے ماموں کے قدموں پر قربان کر دو۔ امام حسینؑ کی بہن کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس ذات بنت علیؑ کتنی بڑی اور عظیم ماں بن گئی تھیں۔ یہ ہے نسوانیت کا وہ معیار جس کے لیے دنیا آج بھی ترس رہی ہے۔ بچوں کو تعلیم دیتے وقت وہ ایک اچھی ماں، اچھی بہن اور ایک قابل قدر حافظ دین ثابت ہو رہی تھیں۔ اسی رات میں امام کی یہ ماں جائی کبھی پیاسے بچوں کی فکر میں مضطرب دیکھی گئی، کبھی عورتوں کی ڈھارس بندھاتی نظر آئی اور کبھی بیمار بھتیجے کی مزاج پرسی کرتی ہوئی پائی گئی۔ قربان ہماری جانیں اس فرض شناس بہن اور حافظ دین پر۔ صاحب مثیر الاحزان نے شب عاشور جناب سکینہ بنت الحسینؑ کا ایک بیان نقل کیا ہے جو ثانی زہراؑ کے کردار کا ایک خاصہ تبصرہ ہے۔ اگر ناظرین اس تاریخی بیان کو بغور ملاحظہ کریں تو ہمارے مقصد پر کافی روشنی پڑے گی اور بنت علیؑ کے کردار کا ایک اچھا خاصا باب سامنے آ جائے گا۔ جناب سکینہؑ ناقل ہیں:

"پانی کی اس قدر قلت تھی کہ ہم ہلاکت کے قریب پہونچ گئے تھے اور اب خالی مشکیں اس قدر خشک ہو گئی تھیں کہ ان کا چمڑا تک سنخ گیا تھا ورنہ جب تک ان میں نمی باقی تھی جس بچہ کی حالت بگڑتی وہ اس پر لٹا دیا جاتا۔ جب نویں کا دن گزر کر رات آئی تو کچھ بچے اسی خیال سے کہ میں شاید مدینہ کی لاڈلی بیٹی ہوں شاید ان کا حلق تر کر سکوں میرے خیمہ میں آئے لیکن پیاس کی شدت سے مجھے نڈھال دیکھ کر وہ مایوس ہو گئے۔ میں ان سب کو ہمراہ لے کر اپنی پھوپھی جناب زینبؑ کے خیمہ میں گئی کہ شاید انھوں نے بڑوں کی نظر سے بچا کر کچھ پانی بچوں کے لیے محفوظ رکھا ہو مگر وہ منتظر بیٹھی تھیں کہ بیمار سے بیٹے شنیع [illegible] گئے اور ہم اپنی پیاس بھول گئے۔ میں نے دیکھا کہ میری پھوپھی بھی [illegible] پیاسی تھیں

کو دیتے، لگتے کبھی اٹھتی ہیں اور کبھی بیٹھ جاتی ہیں اور اس کی یہ حالت ہے کہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ پھوپھی اس کی یہ حالت دیکھ کر بے چین ہیں اور فرماتی ہیں کہ بیٹا علی اصغر! تیری یہ تکلیف دیکھ کر میں کیسے صبر کروں۔ کاش مجھے موت آجائے اور میں تیری یہ کیفیت نہ دیکھوں۔ بیٹا کیا کروں پانی کی ایک بوند بھی ممکن نہیں۔ میں یہ دیکھ کر رونے لگی۔ پھوپھی نے یہ وقت میری آواز سنی اور پہچانی۔ ایک گود میں میرا چھوٹا بھائی تھا اور دوسری طرف میں اور اس طرح کہ وہ تراب کی بیٹی جا در زمین پر گھسٹتی جاتی تھی اور وہ ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ میں تلاش آب کے لئے جاتی تھیں مگر کہیں پانی کی ایک بوند بھی میسر نہ تھی"۔

پس تاریخ گواہ ہے کہ حضرت زینبؑ نے اپنے بچوں کو دین کی حفاظت کی خاطر آنے والے دن کے لیے مرنے کی تعلیم دی اور اسی رات حسینؑ کے بچوں کے لئے پانی کی فکر کی۔ دنیا کی مائیں پھوپھیاں اور خالائیں سبق لیں بنت علیؑ کی اس اعلیٰ ہمتی اور ثبات قدم سے اور دنیا کی عورتیں روشنی حاصل کریں حضرت زینبؑ کی اس بے لوث خدمت حق سے۔

کہنے میں یہ باتیں آسان ہیں اور لکھنا بھی مشکل نہیں مگر ذرا تصور کرنے کی بات ہے۔ شاید صرف تصور ہی کیا جا سکے کہ آپ کا کردار یہاں پر کس قدر ارفع و اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ کیا اس نازک ماحول میں کوئی عورت اپنے حواس قائم رکھ سکتی تھی؟ واللہ یہ صرف حضرت زینبؑ بنت علیؑ ہی کی ذات تھی جو اس وقت بھی اپنے فرائض کا پورے طور پر احساس کر سکیں۔

قارئین کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ مصائب کے متواتر ہجوم نے ان کے دل و دماغ کو معطل کر دیا ہوگا اور قوت احساس ختم ہو گئی ہوگی۔ ایسی صورت میں یقیناً کوئی بھی عمل قابل تعریف نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اس رات موصوفہ کے جذبات کا انتشار اور ان کے ذہن کی مضطرب حالت اور ان کے قلب کی متاثر کیفیت کا اندازہ کرنا ہے تو ان کے مندرجہ ذیل مکالمہ پر غور فرمائیے۔ آپ کا اپنے بھائی کے ساتھ مکالمہ یوں ہوا۔

زینبؑ۔ کاش آج مجھے موت آجاتی اور میرا نقش حیات مٹا دیتی"۔

حسینؑ۔ "جانشین مادر صبر کرو"۔

زینبؑ۔ بھیا! کیا اب تم قطعی طور پر مرنے کو تیار ہو۔

حسینؑ۔ بہن کیا کروں، جینے بھی دیا جاؤں۔

امامؑ کے اس فیصلہ کن جملے نے محبت کرنے والی بہن پر غش طاری کر دیا۔ اب ظاہر ہوا کہ حضرت زینبؑ کے فطری جذبات کثرت آلام کی وجہ سے ہرگز مردہ نہیں ہوئے تھے مگر وہ ماں اور بہن ہونے کے ساتھ ہی اصول دین اور حرمت دین کی محافظ بھی تھیں۔ لہٰذا اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح انجام دے رہی تھیں۔

مجبور و مظلوم بہن نے پوری رات گزاری اور یوم عاشور آیا۔ یہ دن امامؑ کے اس امتحان کا آخری دن تھا جس میں جناب زینبؑ بھی بڑی حد تک شریک تھیں بلکہ وہ جناب زینبؑ کے آنے والے اصلی امتحان کا مبتدا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد دشمن کی فوج سے پہلا تیر چلا۔ حضرت زینبؑ نے صبح سے ظہر تک اور ظہر سے عصر تک ایک ہنگام دیکھا، انجانے پر مصائب کا ایک انبوہ دیکھا۔ جوانوں، بوڑھوں اور بچوں سب کو قربان گاہ حق پر نثار ہوتے دیکھا۔ سکینہؑ کی پیاس اور علی اصغرؑ کی ہچکی، رباب کی بے چینی اور فضہ کا اضطراب سب کچھ دیکھا ——— اور اس سب کے ساتھ یوم عاشورہ بھائی کی بے بسی بھی دیکھی۔ مگر سب کچھ برداشت کیا صرف اس لئے کہ یہ مصیبتیں قیمت تھیں حق و صداقت کی اور وہ امامؑ کے ساتھ حق کی محافظ تھیں۔ صرف یہی نہیں کہ بنی ہاشم کی شہادتوں نے حضرت زینبؑ کے قلب کو برمایا بلکہ انصار کی شہادتیں بھی عظمہؑ کے لئے کم اندوہناک نہ تھیں۔ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ جب امامؑ کے عزیز ترین و مخلص ترین ساتھی جناب حبیب ابن مظاہرؑ کی موت کی خبر بنت علیؑ کے کانوں میں پڑی ہوگی تو آپ کا دل تڑپ نہ گیا ہوگا۔ کیا علیؑ کی مہمان نواز اور خوددار بیٹی کے دل کو ٹھیس نہ لگی ہوگی جب نو وارد نوشاہ وہب کلبی کے جسم کو خون میں نہاتے دیکھا ہوگا۔ زینبؑ بنت علیؑ پر یوم عاشور گوناگوں ذمہ داریوں کا بار تھا۔ وہ ایک بہن ایک ماں اور ایک مہمان نواز خاتون کی حیثیت سے اپنے فرائض

بھی محسوس کر رہی تھیں اور فطری جذبات بھی رکھتی تھیں مگر اس سے بالاتر انھیں اپنے اصل موقف کا خیال بھی تھا جو ان جذبات پر حاوی تھا اور وہ تھا دین کی حفاظت کا خیال۔

جناب زینب یا خاندان رسالت کے کسی بھی فرد کے کردار میں عبادت و ریاضت کے مخصوص تذکرہ کا تو کوئی خاص ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ یہ تو تسلیم شدہ بات ہے ہر حال میں اس خاندان کا بچہ بچہ نماز و فرائض کا پابند تھا چونکہ جناب زینبؑ کے کردار کا ہم تجزیہ کر رہے ہیں اور یہ بھی کردار کا ایک پہلو ہے اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوا۔ مگر صرف مختصرا اشارہ ہی کافی ہے۔ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہاں اہل بیتؑ کے قید ہونے کے بعد کچھ لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب کہ معظمہؑ کا نماز ادا کرنا آپ کے کردار کے غیر معمولی ثبات اور احساس فرض کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً بغیر محمل کے چلتے ہوئے اونٹ پر اور بغیر چھت کے کھلے قید خانہ میں بے سروسامانی میں نمازیں ادا کرنا۔ معصوم سے روایت ہے کہ "میری پھوپھی نے کربلا کے بعد کے تمام عنا زل میں ایک بھی نماز قضا نہیں کی۔"

بہر حال یہ تو عام طور پر کہا گیا کہ شہداء کی شہادت نے معظمہؑ کے قلب کو مجروح کیا ہوگا۔ مگر چند شہداء کی شہادت جناب زینبؑ سے خاص طور پر متعلق تھی۔ ان شہداء میں حضرات علی اکبرؑ، عون و محمدؑ اور امام حسینؑ شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ہم ان میں سے ہر شہید کی شہادت اور بنت علیؑ خاتون کربلا پر اس کے ردعمل اور تاثر کو کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے۔

حضرت علی اکبرؑ سے معظمہ کو خاص ربط تھا۔ تاریخوں، روایتوں میں اور مرثیوں میں جو والہانہ محبت کے الفاظ ملتے ہیں ان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ امام حسینؑ کے یہ صاحبزادے گو حضرت لیلیٰ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے مگر ان کی پرورش جناب زینبؑ نے کی تھی اور اس اعتبار سے جناب زینبؑ ہی ان کی ماں تھیں۔ ان کے عازم جنگاہ ہونے پر امام کی ماں جائی پر کیا گزری اور انھوں نے اپنے قلب کو کیسے سنبھالا۔ اس کے لئے نہ تو تاریخ کے الفاظ ہی کافی ہیں اور نہ اگر حضرت زینبؑ خود چاہتیں تو وہی اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکتی تھیں۔ یہ تو بس ایک عورت محسوس کر سکتی ہے جو محبت کرنے والی ماں اور پھوپھی دونوں بیک وقت ہو اور خدا نہ کرے اس کا بیٹے کی مانند بھتیجا مرنے کے لیے کمر بستہ ہو۔ کس طرح پھوپھی نے بھتیجے کو رخصت کیا اور کیسے امام حسینؑ علی اکبرؑ کو حضرت زینبؑ سے بلکہ حضرت زینبؑ کو علی اکبرؑ سے چھڑا سکے۔ اس کے مفصل ذکر کو نظر انداز کر کے ہم "تاریخ" کے صرف ایک فقرہ کی طرف ناظرین کا خیال متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ فقرہ واضح کر دیگا کہ خاتون کربلا پر حضرت علی اکبرؑ کی جدائی کس قدر سخت تھی۔

علامہ مجلسی نے بحار الانوار جلد دہم میں حمید بن مسلم سے روایت کی ہے کہ "علی اکبرؑ کی لاش پر امام سے پہلے حضرت زینبؑ پہونچ گئی تھیں۔" عقل حیران ہے کہ وہ زینبؑ جو شہادت پر بے تابانہ خیمہ سے نکل کر لاش پر پہونچ گئیں وہ یہ جانتے ہوئے کہ بچہ مرنے کو جاتا ہے کیونکر رخصت ہی کر سکی ہوں گی۔ مگر تاریخیں گواہ ہیں کہ حسینؑ کی ماں جائی ثانی زہراؑ نے دل پر پتھر رکھ کر صبر کیا۔ نہ انھوں نے دامن چاک کیا نہ سر پیٹا بلکہ امام نے ان کو فوراً احترام کے ساتھ خیمہ میں واپس کر دیا اور وہ معظمہ حواس کو قائم رکھتے ہوئے خیمہ میں واپس تشریف لے آئیں۔

ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور اب پھر لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ناظرین اس حقیقت کو جناب زینبؑ کے کردار میں برابر ملاحظہ فرمائیں کہ آپ کے کردار میں ضبط و اضطراب، صبر و بے چینی برابر اور یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ آپ کے احساسات مردہ ہوئے تھے اور نہ آپ مصائب کو برداشت کرنے میں ناکام ہوئی تھیں بلکہ آپ کے کردار کا نفسیاتی جائزہ یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ حواس قائم رکھتے ہوئے مصائب کو شعوری اور شعوری طور پر برداشت کر رہی تھیں کیونکہ حق کی حفاظت کا عظیم مقصد ان کے پیش نظر تھا۔

حسینؑ کی مظلوم بہن نے اپنی آنکھوں سے اس کرتا یا جلادان کا

برچھی سے زخمی سینہ دیکھا جس کو بچپن سے پالا تھا گو کہ یہ نسوانی نفسیات سے بالاتر معلوم ہوتا ہے مگر بہر حال تاریخ کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔

تاریخیں یہ بھی لکھتی ہیں کہ بنت علیؑ خاتون کربلا نے اپنے ننھے بچوں کا قتل بھی بڑی شان کے ساتھ دیکھا۔ شان کے ساتھ بایں معنی کہ ارادی طور پر بچوں کو رن کی اجازت دی تاکہ وہ قربان گاہِ حق پر نثار ہو جائیں۔ اس وقت کا تصور قلب کو تڑپاتا ہے جب خاتون کربلا کے لال امام کے پاس اسلحۂ جنگ سج کر ماں کی سفارش کے ساتھ جنگ کی اجازت لینے آئے ہوں گے۔ اس مقام پر ہمیں امام حسینؑ کے عمل پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح وہ لاڈلے بھانجوں کو اذنِ جہاد دے سکے۔ کیا امام کے دل میں ان کی شہادت کے تصور نے تلاطم برپا نہ کر دیا ہوگا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ زینبؑ کس طرح علی اکبرؑ کی موت پر پریشان حال خیمہ سے باہر نکل آئی تھیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کو بھی خاتون کربلا کے عزائم پر مکمل اعتماد تھا۔ تب ہی تو وہ عون و محمدؑ کو اذنِ جہاد دینے پر تیار ہو گئے۔ تاریخ میں اس لمحہ کا تذکرہ اپنی جدا حیثیت رکھتا ہے جب مخدومہ نے اپنے دل کے ٹکڑوں کو خون میں نہاتے دیکھا۔ خاتون کربلا کے کردار پر ایک مجموعی نظر رکھتے ہوئے یہ تصور بعید از قیاس نہیں کہ زینبؑ عون و محمدؑ کی شہادت پر شکر خدا بجا لائی ہوں گی کہ ان کے ہدیہ کو قبول کر لیا گیا۔

ذرا زینبؑ کے اس عمل کا تجزیہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ اس فخر بناتِ حوا میں خدمتِ خلق، خدمتِ دین، جذبہ برادری، خلوص و محبت، فرض شناسی وغیرہ وغیرہ کے جذبات کس معراج کمال کو پہونچے ہوئے تھے۔ عقلاً اور فطرتاً یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ماں جو بہر حال انسان ہو کیونکر عمل کی یہ بلند منزل پیش کر سکتی ہے۔ مختصراً ہم راشد الخیری صاحب کا ایک جملہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو ان کا اپنا تاثر اور فیصلہ کن توجیہ ہے جو ہمارے ذہن کی رسائی خاتون کربلا کے کردار کی نفسیاتی تہوں تک کرانے کے لئے کافی ہو۔ لکھتے ہیں:۔

"جو ماں اپنے بچوں کو خود لباسِ جنگ سے آراستہ کر سکے وہ یقیناً اور حتماً ان کی شہادت پر درگاہ خدا میں شکر بھی ادا کر سکتی ہو۔"

(سیدہ کا لال۔ از راشد الخیری مرحوم صفحہ ۱۶۰)

اور اگر ناظرین کو اب بھی تعجب ہو تو جناب زینبؑ کے اس سبق کو یاد کر لیں جو ان معظمہ نے شب عاشور اپنے بچوں کو دیا تھا اور ان جذبات کو ذہن میں محسوس کر لیں جو حضرت زینبؑ کے دل میں امام حسینؑ، اطفالِ حسینؑ اور اصولِ حسینؑ کی خاطر تھے بس ظاہر ہو جائے گا کہ خاتون کربلا نے کیونکر ان بچوں کو جنگ کے لیے اجازت دلوائی اور کیونکر وہ ان کی شہادت پر آنسوؤں بھرا اطمینان ظاہر کر سکیں۔

اب ہم اس شہادت کا بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں جس نے فرات کے پانی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور جس نے آسمان کے ہمیشہ چمکنے والے سورج کا منھ کالا کر دیا تھا۔[۵] مگر ہم اپنے ناظرین کو حتماً اور حلفاً یقین دلا سکتے ہیں کہ خاتون کربلا نے ماں جائے کی شہادت کو اپنی دونوں کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

قبل اس کے کہ امام کی شہادت اور اس سلسلے میں حضرت زینبؑ کا عمل اور ردِ عمل بیان کیا جائے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کا جسمانی اور نفسیاتی کیفیات کا ہلکا سا خاکہ کھینچ دیا جائے۔ یہ عصر کا وہ قیامت خیز وقت تھا جب ان دونوں بھائی بہن پر تیسرا دن بھوک اور پیاس کا تھا۔ تین دن کی بھوک اور پیاس کہنے کو سب کہہ دیتے ہیں لکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ آج تک نہ تو کسی کو اس کا صحیح احساس ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

---

[۵] یہ تاریخی حقیقت ہے کہ امام کی شہادت پر طوفان آیا زلزلہ آیا اور سورج کو گہن لگا۔ صرف شیعی روایت نہیں ہے۔ حوالہ کے لئے دیکھئے۔ ابو مخنف، جلال الدین سیوطی، ابو اسحاق اسفرائنی مصنف روضۃ الصفا وغیرہ ان تمام نے اس طوفان کا تذکرہ کیا ہے۔

کربلا کے اس تپتے میدان میں خاندان رسالتؐ پر کیا گزر رہی تھی یہ یا تو وہ خود جانتے تھے یا اُن کا خدا۔ اس پیاس میں یوم عاشور سے قبل کے تمام مصائب سے قطع نظر صرف صبح سے اسوقت تک بہترؑ اعزا و انصار کی صف ماتم خیمہ میں بچھ چکی تھی اور یہ دونوں ان سب کو رو چکے تھے ان مرنے والوں میں علی اکبرؑ جیسا خوش رو جوان، عباسؑ جیسا جوانمرد بھائی، عون و محمد جیسے بچے اور علی اصغرؑ جیسا معصوم سب ہی شامل تھے۔ ان سب کی جدائی کا غم حضرت زینبؑ اور امام حسینؑ پر کیا اثر کرچکا تھا۔ اس کے صحیح احساس کی بس ایک ہی صورت ممکن ہے کہ کبھی ایسے گھر میں جاکر کھڑے ہو جائیے جس میں کسی بوڑھے سے بوڑھے شخص کی موت ہوگئی ہو اور اس کے بعد کربلا میں حسینؑ اور زینبؑ کی مصیبت کا اندازہ کر لیجئے۔ شہادتوں کے غم کو یہ دونوں کس طرح برداشت کر سکے۔ اس کی تشریح میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں ہی حق کے سامنے باطل کی گستاخیوں کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ طے کرچکے تھے کہ باطل کے دیو کو ذلت کے انتہائی گہرے غار میں گرا دینا ضروری ہے۔ بس یہ حق پرستی کا جذبہ تھا جو ان کے نفوس کو تقویت پہونچا رہا تھا اور وہ مصائب برداشت کر رہے تھے۔ اس حد تک تو کہا جا سکتا ہے کہ امام حسینؑ کے تقریباً تمام ساتھیوں کو یہی مصائب کم و بیش پیش آئے تھے اور ان سب ہی کی ایسی کیفیت ہو سکتی تھی مگر ایک چیز جو اس وقت شاہ کربلا اور ان کی ہمشیر کے لئے سخت ترین تھی اور جس میں کوئی تیسرا شریک نہ تھا وہ تھا مستقبل کا خیال۔ امام حسینؑ اب تک چونکہ قافلہ کے سردار بنے ہوئے تھے اس لئے انھیں یہ فکر ستا رہی ہوگی کہ میں بے یار و مددگار قافلہ کی سالاری کس کو دوں گا۔ قطعاً امام حسینؑ کے مقابلہ میں حضرت زینبؑ کے کردار کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ اس وقت حضرت زینبؑ پر مستقبل کے واقعات کی تفصیل عیاں نہیں تھی۔ امام حسینؑ پر تو سارا نقشہ بے نقاب تھا۔ وہ علم امامت سے جانتے تھے کہ کیا ہوگا اس لیے شاید انھیں کچھ اطمینان رہا ہو۔ مگر خاتون کربلا کو مستقبل کے حالات کا علم بھی نہ تھا۔ وہ تو بس یہ جانتی تھیں کہ کچھ ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جو عالم ظلم میں ہے۔ مگر واہ ری زینبؑ! — اس کے باوجود وہ ارادی اور اختیاری طور پر تیار تھیں کہ جو کچھ ہوگا اس کو بخوشی برداشت کیا جائے گا اور حسینیت کا نشر و اعلان کیا جائے گا۔

اب ان نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کی روشنی میں غور کیجئے کہ کیونکر امام کو ماں جائی نے رخصت کیا ہوگا اور کیونکر حسینؑ رخصت ہوئے ہوں گے۔ کس طرح حضرت زینبؑ نے ماں جائے کو ذبح ہوتے دیکھا ہوگا اور کیسے مجبور بھائی نے ذبح ہوتے وقت بہن کو پریشان حال دیکھا ہوگا۔

غرضکہ اب ہنگام عصر وہ وقت آیا جب کہ حضرت زینبؑ کی محبتوں کا مرکز، باپ کی یادگار اور نانا کی نشانی، ماں کی محنتوں کا نتیجہ اور علیؑ کا شبیہ یعنی امام عصر آواز استغاثہ بلند کرچکنے کے بعد آخری مرتبہ رخصت ہونے کے لئے آیا۔

حسینؑ غریب پر سخت ترین وقت وہ تھا جب آپ اہل بیت سے آخری مرتبہ رخصت ہو رہے تھے۔ یقیناً اس وقت اہلبیت کے مستقبل کا خیال امام کے قلب کو برما رہا ہوگا۔ امام نے سکینہؑ کے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو، رباب کا اُجڑتا ہوا سہاگ، اور معزز و محترم بیبیوں کے مصائب کا تصور ضرور کیا ہوگا۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر امام نے اس دلدوز موقع پر اپنی چہیتی بہن کو کس طرح رخصت کیا ہوگا دل تھام کر اس کا تصور کیجئے اور حضرت زینبؑ اور حسینؑ غریب کی نفسیاتی کیفیتوں کا اندازہ کیجئے۔ امام نے شہادت کی تیاری کے وقت اپنا بوسیدہ لباس طلب کیا اور بہن نے بھائی کو شہید ہونے کے لیے یہ آخری لباس اپنے ہاتھوں سے — شاید کانپتے ہوئے ہاتھوں سے — لاکر دیا۔

امام کی رخصت آخر کے وقت ہی سے خاتون کربلا نے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں اور اسی وقت سے حضرت زینبؑ کا حقیقی رول شروع ہو جاتا ہے۔ اب تک آپ کا رول ثانوی حیثیت رکھتا تھا اور وہ صرف حسینؑ کی شریک کار

تھیں مگر اس وقت جب کہ امامؑ اپنے اہل بیتؑ کو سخت ترین مستقبل کے حوالے کر کے شہید ہونے کے لئے چلنے لگے اسی وقت سے خاتون کربلا نے شاہ کربلا کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ ہر سپاہی کے رخصت ہونے وقت عرب کے رواج کے مطابق امام سوار کراتے اور رخصت کرتے تھے مگر جب امام کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو کوئی سوار کرانے والا نہ تھا۔ علیؑ کی لاڈلی نے سیدہؑ کے لاڈلے کی نیابت کی اور امام وقت کو جہاد کے لئے یوں رخصت کیا کہ اپنے ہاتھ سے ان کے گھوڑے کی رکابیں تھامیں۔ شاید زمین لرز گئی ہو اور عرش کانپ گیا ہو امام عصرؑ کی اس غربت پر، مگر میں تصور کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ نہ علیؑ کی بیٹی کا ہاتھ کانپا ہوگا اور نہ شبیرؑ جیسے لاڈلے کے قدموں میں جنبش آئی ہوگی۔[۱]

اس وقت جس سرعت کے ساتھ حسینؑ کی ہمشیر کا قلب دھڑک رہا ہوگا اس کا اندازہ ہمارے حلم و تصور سے باہر ہے۔ بہن نے دھڑکتے ہوئے دل اور بے چین دماغ سے بھائی کو خدا حافظ کہا ہوگا۔ مگر کچھ ہی دیر میں ان آنکھوں نے لاکھوں سواروں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ایک حسینؑ اور لاکھوں حربیوں کا منظر خاتون کربلا نے جس طرح دیکھا ہوگا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

تاریخ میں ہے کہ جب امامؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لے آئے اور ایک مرتبہ پھر شاید آخری بار یہ منظر دیکھا تو خاتون کربلا کی شبیر دل خاتون ایک بلند ٹیلے پر آ گئی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ بھائی کی رخصت کے بعد سے برابر بھائی پر نظر جمائے ہوئے تھیں۔ اسی لئے تو ایسا ہوا کہ امام جونہی گھوڑے سے گر کے نشیب میں پہنچے معظمہ فوراً بلندی پر تشریف لے گئیں۔ آپ کے اس عمل سے دو نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت زینبؑ کو امام حسینؑ سے والہانہ محبت تھی اور دوسرے یہ کہ جس طرح امام ہر مجاہد کی خبر گیری کرتے رہے تھے ویسے ہی ان کی نائب خاتون کربلا خود امام کی خبرگیری کر رہی تھیں۔

امام حسینؑ میں جب تک دم تھا اعدائے دین کو نصیحتیں کرتے رہے اور اپنا تعارف کراتے رہے تاکہ قیامت میں وہ لوگ کسی قسم کی ناواقفیت کا عذر نہ کر سکیں۔ مگر جب امام گھوڑے سے زمین پر آ گئے اور بدترین خلائق جب شمع امامت کو گل کرنے کے درپے ہوا تو امام کی جگہ علیؑ کی بیٹی اور حسینؑ کی بہن زینبؑ نے اتمام حجت کے فرض کو انجام دیا اور ابن سعد کو پکار کے کہا۔

"اے عمر سعد! ابو عبداللہ (یعنی حسینؑ) قتل ہو رہے ہیں اور تو کھڑا دیکھ رہا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی"

ظاہر ہے کہ ان بدکرداروں کو شرم آ رہی کیا کر سکتی تھی مگر دراصل یہ بنت علیؑ کی آخری حجت تھی جو انھوں نے انجام دی تاکہ حق و ہدایت کا وہ فرض پوری طرح ادا ہو جائے جو اس گھرانے کا مسلک تھا۔

بیان کیا گیا کہ قاتل کو للکارنے کے لئے بہن خیمہ سے نکل آئی تھیں اور غیرت دار بھائی نے جب بہن کو اپنی زندگی میں باہر دیکھا تو بعض روایتوں کے مطابق اس ضعف و نڈھال اور بے بسی کے عالم میں کہنیاں ٹیک کر سر اٹھایا اور فرمایا۔ "بہن خیمہ میں جاؤ ابھی حسینؑ زندہ ہے۔"

یہاں یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ امام حسینؑ کو حضرت زینبؑ کا زیادہ خیال تھا یا حضرت زینبؑ کو امام حسینؑ کا یا دونوں میں سے کس کو کس کی محبت زیادہ تھی۔

چند ہی لمحوں میں خاتون کربلا نے کربلا کی فضا کو تاریک،

---

[۱] ہم نے عمداً جناب زینبؑ کو امام حسینؑ کا نائب کہا ہے۔ ہم امام حسینؑ کو دو حیثیتوں میں دیکھتے ہیں۔ ایک تو بہ حیثیت امام کے۔ اور اس حیثیت میں حضرت سید سجادؑ ان کے نائب تھے اور دوسرے خاندان کے ذمہ دار کی حیثیت سے۔ اس حیثیت میں جناب زینبؑ ان کی نائب تھیں۔

ہوتے دیکھا۔ فرات کی موجوں کو کروٹیں بدلتے دیکھا اور زمین کربلا کو تڑپتے دیکھا اور "الا قتل الحسین بکربلا" والا ذبح الحسین بکربلا" کی جگر خراش آوازوں کو اپنے کانوں سے سنا۔ تاریخ سے صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ جس وقت حسینؑ کا سر تن سے جدا کیا گیا اس وقت ان کی ماں جائی کہاں تھیں، مگر تاریخی قیاس یہ بتاتا ہے کہ حضرت زینبؑ اس وقت خیمہ میں یتیم بچوں اور غریب بی بیوں کے پاس رہی ہوں گی۔ کیونکہ اول تو اس دل دوز وقت میں اہل بیتؑ کو سنبھالنا انھیں کی ذمہ داری تھی جس کا انجام دینا ضروری تھا اور دوسرے بھائی کے حکم یا خواہش کو پورا کرنا ضروری تھا۔ اس لئے قیاس ہے کہ یقیناً ثانی زہراؑ اس ٹیلے سے فوراً خیمے میں واپس آ گئی ہوں گی۔ اب غور کیجئے کہ خیمے میں امام کے قتل کی خبر سے جناب سکینہؑ کی بیتابی، رباب کی کیفیت، چھوٹے بچوں اور لاوارث عورتوں کی حالت سب کچھ حضرت زینبؑ کے سامنے رہی ہو گی۔ اس ماحول میں خاتون کربلا سب کو کیونکر سنبھال سکی ہوں گی اور انھیں ایک وقت کتنے کام انجام دینا پڑے ہوں گے، اس کا تصور بڑا مشکل ہے۔ معظمہ ہی اس وقت سب کی ذمہ دار تھیں۔ ایک خاتون نے اس نازک وقت میں ننھی سکینہ کے بہتے ہوئے آنسو پونچھے ہوں گے، رباب کی ڈھارس بندھائی ہو گی، فضہ کا غم غلط کیا ہو گا، انصار کی عورتوں کو ان کے مردوں کا پرسا دیا ہو گا، بیمار بھتیجے کی مزاج پرسی کی ہو گی اور ان سب میں کونسا کام پہلے اور کونسا بعد میں انجام دیا ہو گا ان سب باتوں کے تصور سے عقل عاجز ہے۔ اپنے قلم کی کم مائیگی کا اعتراف کرنے کا بھی مقام ہے جو کام جناب زینبؑ نے اس ہنگام میں انجام دیئے ہوں گے ان کی فہرست مرتب کر کے لکھ دینا بہت آسان ہے جو بالعموم لوگ کرتے ہیں، مگر ان کے انجام دینے میں پیش آنے والی دشواریوں کا صحیح طرح احساس کرا سکنا بڑا مشکل کام ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین خود ہی اس کو بس محسوس کر لیں۔

یوم عاشور خاتون کربلا پر مصائب اور امتحانات اپنی نوعیت کے جدا تھے بہ این معنی کہ دنیا کی تاریخ میں کسی ایک فرد پر اتنے سخت اور یکے بعد دیگرے مصائب ہرگز نہیں پڑے۔[1] یہ ثانی زہراؑ کی ہی ذات تھی جو شعوری اور ارادی طور پر پے در پے بہت تھوڑے وقفہ سے نازل ہونے والی مصیبتوں کو برداشت کر لے گئی اور جادۂ حق پر قائم رہی۔ ہمارے ہزاروں درود سیدہ کی لاڈلی پر، لاکھوں سلام علیؑ کی اس بیٹی پر اور خدا کی ہزاروں رحمتیں چمن شہادت کی اس رکھوالی پر۔

[1] جناب صادق حسین صاحب مرحوم نے اپنی کتاب ثانی زہراؑ میں خاتون کربلا کے کردار کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شیعہ یتیم خانہ میں دو غم کی مجلس

یتیم زادہ الحجتین مرحوم کی مجلس چہلم ۷ ستمبر کو ساڑھے چار بجے شام شیعہ یتیم خانہ میں سید مظفر حسین صاحب طاہر جرولی وکیل ذاکری فرمائیں گے۔ اس کے بعد فاتحہ خوانی ہو گی۔ اس کے بعد نماز مغربین زیر اقتدار جناب سرکار عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ ہو گی۔ نماز کے بعد گورنر اسلامیہ فضل علی صاحب مرحوم کی مجلس فاتحہ خوانی منعقد ہو گی جس میں جناب سید شبیہ الحسن صاحب ایم اے

لکچر یونیورسٹی ذاکر ہی فرمائیں گے

باب چہارم

بنتِ علیؑ کوفہ میں داخل ہونے سے قبل

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد تاریخ اسلام کے وہ تاریک ترین لمحات آتے ہیں جب اہل بیت رسولؐ کے ساتھ خود کو مسلمان کہنے والے گروہ نے بدترین سلوک کا مظاہرہ کیا۔ ادھر امامؑ کا سرتن سے جدا ہوا اُدھر مسلمانوں کے لشکر نے نبیؐ کی آل کو لوٹنا شروع کر دیا۔ خیموں میں آگ لگادی، بیبیوں کے سروں سے چادریں چھینی جانے لگیں، بچیوں کے کانوں سے گوشوارے اس طرح سے چھینے گئے کہ ان کے کان تک زخمی ہو گئے۔ خاندان رسالتؐ کے بچے اس ہنگامے میں اس طرح بھاگتے پھرتے تھے کہ کسی کے دامن میں آگ لگی تو کسی کے سر میں خاک۔ اگر امام حسینؑ کی شہادت ظلم تھی تو خاندان رسالتؐ کی یہ توہین عظیم تر ظلم۔ کسی بھی ستمگر فاتح لشکر نے آج تک عورتوں اور بچوں پر یہ ظلم روا نہیں رکھا تھا جو آج خواتین کربلا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس قیامت خیز منظر کو دیکھ کر صبر کر سکنا تو واقعی کارنامہ تھا جو زینبؑ نے کر دکھایا مگر کردار زینبؑ کا اس سے زیادہ روشن پہلو یہ تھا کہ انھوں نے اس مصیبت کے انبوہ میں اپنے فرائض کا بہ حیثیت بزرگ خاندان پوری طرح احساس کیا تھا۔

اس بیتے بن میں یہ بے کس و لاچار خاتون اپنے بیمار بھتیجے کے لیے کوئی آرام مہیا نہ کر سکی تھیں۔ امام حسینؑ جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اب جو کچھ تھیں وہ حضرت زینبؑ ہی تھیں بیمار کربلا کو صرف ایک آسائش مہیا کی جا سکی تھی اور وہ یہ کہ وہ ایک بستر پر غفلت کی حالت میں آرام کر رہے تھے۔ مگر کیہ تکر فکیا جائے کہ محبت کرنے والی پھوپھی نے اپنے سامنے بیمار بھتیجے کے نیچے سے ظالم مسلمانوں کو بستر گھسیٹتے ہوئے دیکھا اور بے بسی و بے کسی کے باعث کچھ نہ کر سکیں، صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

شائد آج کے دور میں چادر کا بیبیوں کے سروں سے اُتر جانا معمولی بات معلوم ہو۔ مگر اس چیز کو ذرا خالص اسلامی نظریہ کے پس منظر میں دیکھئے۔ وہ زینبؑ جن کا چادر اوڑھ کر خیمہ سے نکل آنا امام حسینؑ کو ناگوار ہوا تھا اور آپ نے بڑھ کر اپنی ردا بہن پر ڈال دی تھی اور وہ زینبؑ جن کے رونے کی آواز نامحرم مردوں کے کان میں پڑنا علی مرتضیٰؑ کو گوارا نہ ہوا تھا ——— ہاں وہی زینبؑ بنت علیؑ اس وقت بلوہ عام میں بے مقنع چادر پریشان حال پھر رہی تھیں۔ ہر بی بی کو اسی حال میں دیکھ رہی تھیں اور ان سب کی دیکھ بھال کا فریضہ بھی انجام دے رہی تھیں۔

شام غریباں کی ان منحوس ترین ساعتوں میں زمانۂ جاہلیت کا بدترین سلوک بھی روا رکھا گیا اور وہ یہ کہ حسینؑ کے لٹے ہوئے خیموں کو آگ لگا دی گئی۔ سوختہ دل اور مصیبت زدہ خواتین کربلا نے دیکھا کہ اس دروازہ میں جو جبرئیل کے لئے قابل قدم تھا مسلمان دراتے گھسے آتے ہیں، لوٹتے ہیں اور آگ لگاتے ہیں۔

بعد عصر جب اشقیا نے خیموں میں آگ لگائی ہے تو عجب سراسیمگی کا عالم تھا۔ جب ایک خیمہ سے شعلے بھڑکنے لگتے تو مخدرات عصمت بچوں کو لے کر دوسرے خیمے میں پناہ لیتیں اور جب وہ خیمہ بھی جلنے لگتا تو تیسرے خیمے میں چلی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ جب آخری خیمے میں آگ لگنے لگی تو خواتین کربلا امام عصر حضرت سید الساجدین کی اجازت سے سب کو لے کر باہر نکل آئیں اور جان کی حفاظت کرنا ضروری سمجھا اس لئے کہ جلتے ہوئے خیمے کے اندر رہنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ حسینیت کی تبلیغ کی خاطر اپنی جان کو بچائے رکھنا اور بھی ضروری تھا۔ ورنہ حسینؑ کا پیغام کربلا کے میدان ہی میں دفن ہو کر رہ جاتا۔

اس مقام پر خاتون کربلا حضرت زینبؑ کبریٰ کا ایک عمل ہمارے دل میں ان کے لئے عزت و احترام اور قدر و منزلت کی لامحدود وسعتیں پیدا کر دیتا ہے۔ اوّل تو ایک عورت پھر معزز گھرانے کی عورت اور پھر ایسی عورت جس نے آج سے قبل کبھی آگ اور بلوہ کا ایسا قیامت خیز منظر نہ دیکھا تھا۔ جب اس مقدس خاتون میں فرض و ذمہ داری کا جذبہ جاگ جاتا ہے تو یہ اتنا بڑا کام کر ڈالتی ہے کہ اس کی مثال تاریخ عالم قیامت تک نہ پیش کر سکے گی۔ قبل اس کے کہ بنت علیؑ کا وہ ذمہ دارانہ رول بیان کیا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ان کے گرد و پیش کا ہلکا سا نقشہ بھی بیان کر دیا جائے تاکہ ناظرین کو موقع کی نزاکت اور حالات کی شدت کا کسی حد تک احساس ہو سکے اور پھر اس پس منظر میں معظمہ کے اس گراں قدر فعل کو سراہا جا سکے۔ اس وقت ننھے ننھے بچے آگ سے پریشان آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ظالم سامان لوٹ چکنے کے بعد بچوں اور عورتوں کو دُرّوں اور طمانچوں سے اذیت پہونچا رہے تھے، بچوں کے نازک رخساروں پر تھپیڑ پڑ رہے تھے اور بیبیوں کو برہنہ سر کیا جا رہا تھا —— اس ماحول میں ہر بی بی اور بچے کی نظر حضرت زینبؑ پر تھی کیونکہ وہی ان کی ذمہ دار تھیں اور انھیں سے ہر شخص کو امید تھی۔ مگر موصوفہ کیا کر سکتی تھیں؟ —— کچھ بھی نہیں۔ اب اس کچھ بھی نہ کر سکنے سے حضرت زینبؑ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی یہ ضبط تحریر سے باہر ہے —— مصیبت سے لبریز اس ماحول میں گھری ہوئی شیر خدا کی لاڈلی کو خیال آیا کہ بھیا کی امانت، امامت کا آفتاب، خاندان رسولؐ کا چشم و چراغ اور حسینؑ کا لخت جگر اس وقت اس جلتے ہوئے خیمے ہی میں رہ گیا تھا۔ حضرت سید سجادؑ میں ضعف و نقاہت اس قدر تھی کہ وہ حرکت بھی نہ کر سکتے تھے۔

کوئی تعجب نہیں کہ شمر کے بستر کھینچ لینے کے بعد سے اب تک شاید آپ منھ کے بل ہی پڑے رہے ہوں۔ خاتون کربلا کو بیمار بھتیجے کا خیال آیا اور انھوں نے انسانیت، امامت نسل حسینؑ، اسلام و ایمان سب پر قیامت تک رہنے والا احسان کیا۔ حضرت زینبؑ نے دنیا کا بلند ترین فعل انجام دیا۔ علیؑ کی بیٹی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں بے دھڑک خیمہ کے اندر گھس گئیں اور بیمار بھتیجے کو آگ سے باہر نکال لائیں۔

دنیا کے فائر بریگیڈ محکمے ہو جائیں خاتون کربلا کے عمل کی اس سرعت پر اور عالم کے مرد روحانی طاقت حاصل کریں معظمہؑ کے دل کی قوت سے۔ درحقیقت یہ علیؑ و فاطمہؑ کا خون تھا جو ان رگوں میں دوڑ رہا تھا ورنہ کبھی ان حالات میں ایسا عمل ممکن نہ تھا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ حضرت زینبؑ کے عمل کو دو پہلوؤں سے دیکھنا ہوگا۔ ان کا ہر عمل اول تو بہ حیثیت حسینؑ کی بہن کے تھا اور دوسرے بہ حیثیت محافظ اسلام کے۔ چنانچہ جناب سید سجادؑ کو جلتی آگ سے نکال لانا بھی دو جذبوں کے ماتحت تھا۔ ایک تو بھتیجے کی محبت اور دوسرے امامت اور دین و ایمان کو محفوظ کر لینے کا جذبہ، ہماری ہمتیں فدا خاتون کربلا کی اس اعلیٰ ہمتی پر جو اس سخت ماحول میں بھی اپنا فرض محسوس کر سکیں اور اس کو انجام بھی دے سکیں۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ شام غریباں کے دلدوز منظر سے دو ایک واقعات اور نقل کر دیں اور ان معظمہ کے ذمہ دارانہ کردار کی کم از کم ایک جھلک اپنے ناظر کو دکھا دیں۔

ابو مخنف کی سند سے تاریخ کا ایک معمولی سا واقعہ حضرت کی زندگی پر بے مثل روشنی ڈالتا ہے۔ واقعہ معمولی ہے مگر زینبؑ بنت علیؑ کے لئے نہیں۔ ان پر یہ مصیبت بالائے مصیبت زخم پر نمک پاشی تھی۔ لیکن موصوفہ نے اس کو برداشت کر لیا۔ یہ امر تاریخ کے طالب علم کے لیے ناقابل یقین نہیں ہے کیونکہ تاریخ بہرحال اس سے سخت تر واقعات کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جن پر واقعی شبہ ہوتا ہے کہ زینبؑ بنت علیؑ کسی ما فوق البشر ہستی کا نام ہے۔ عاشور کو بعد عصر فوج کی درندگی اور بہیمیت کو دیکھ کر قبیلۂ بکر بن وائل کی ایک عورت اس مجمع سے نکل کر دشمنوں پر تلوار چلانے لگی اور ان کو شرمندہ کرنے لگی کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ آل محمدؐ کو لوٹتے ہو؟ حضرت زینبؑ نے دیکھا کہ اس عورت کا شوہر ہاتھ پکڑ کر اسے اندر پہونچا آیا۔ آپ اندازہ کیجئے ابو تراب کی بیٹی پر اس ظلم سے یقیناً زمین تنگ ہو گئی ہوگی۔ شارع اسلام کی نواسی کن آنکھوں سے اس منظر کی تاب لا سکی ہوگی جب کہ اس نے اپنے کو بلوۂ عام میں بے یار و مددگار اور ایک معمولی عورت کی بہ قدر افزائی دیکھی ہوگی اس وقت خاتون

کربلا کے کانوں میں وفادار عباسؑ کے یہ ولولہ انگیز الفاظ گونجے ہوں گے "کون ہو جو عباسؑ جیسے بھائی کے ہوتے ہوئے زینبؑ کی چادر چھین سکے" مگر ساتھ ہی حسینؑ کے وہ الفاظ بھی یاد آئے ہوں گے جو انھوں نے آخری رخصت پر فرمائے تھے۔ "بہن صبر کرنا!" اس وقت حضرت زینبؑ امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ دونوں کی بہن تھیں۔ اس وقت آپ جذبات و صبر کا مجموعہ اور کردار کا مکمل مجسمہ تھیں۔ آپ نے یہ واقعہ دیکھا اور اپنی بے کسی پر صبر کیا۔ اس پر نہ صدائے احتجاج بلند کی اور نہ حواس کھوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس واقعہ نے حضرت خاتون کربلا کے کردار میں مزید پختگی پیدا کر دی ہوگی اور انھوں نے اس کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو مزید ہمت و جوش کے ساتھ انجام دیا ہوگا۔ آگے چل کر جو ان کے عمل میں ایک ٹھہراؤ سنجیدگی اور مستقل مزاجی ملتی ہے اس میں اس جیسے واقعات کا کافی حصہ رہا ہوگا۔ بہر حال تاریخ شاہد ہے کہ سیدہ کی لاڈلی بہ جبر خیمہ سے باہر لائی گئی اور ایک معمولی عورت کو احترام کے ساتھ خیمہ میں پہونچا دیا گیا۔ تاریخ کا یہ واقعہ خدا کی خدائی میں ظہور پذیر ہوا۔

بعد عصر ان بے سہارا بیبیوں اور بچوں کی مصیبت شہدائے کربلا کی مصیبتوں سے کم نہ تھی۔ اگر ان کو آفتاب کی تمازت کا سامنا تھا تو ان کو جلتے ہوئے خیموں کی تپش کا۔ اگر ان کو سپاہیوں کی تلواریں ستاتی تھیں تو ان کو درندہ صفت انسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے تازیانے۔ فرق یہ تھا کہ وہ جو انمرد تھے اور یہ صنفِ نازک کی چند فردیں یا ننھے ننھے بچے۔ تعجب ہو کہ آسمان کیوں نہ پھٹ پڑا اور زمین کیوں نہ تنگا فنہ ہو گئی؟ شاید قدرت جواب دے اسلئے تاکہ زینبؑ کا بے مثل کردار دنیا کے سامنے آسکے۔

یوم عاشورہ لاشِ امام کو پامال کرنے والوں کا یہ قبیح فخر تاریخ کو آج تک یاد ہے ــــ "........ کہ ہم نے لاشِ حسینؑ پر گھوڑے دوڑائے اور اس طرح جیسے چکی گیہوں پیستی ہے"[1] کیا یہ قابل یقین ہے کہ حسینؑ کی لاڈلی ماں جائی اس پر صبر کر سکی ہوں گی۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے صبر کیا۔

شام غریباں سے متعلق ایک روایت مشہور ہے[2]۔ اہلِ حرم لوٹے جا چکنے کے بعد ایک قنات کی آڑ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ عمر بن سعد نے کچھ کھانا اور پانی ان کے لئے بھجوایا۔ ہماری توجیہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ کھانا پانی اس لئے بھجوایا گیا تھا تاکہ حسینؑ کے اہل بیت میں زندگی کے کچھ آثار آجائیں اور ان کو ابن زیاد کے دربار تک لے جایا جا سکے۔ ورنہ غالباً شدتِ عطش و گرسنگی ان غریبوں کی ہلاکت کا سبب بن جاتی۔ دوسرے یہ کہ باوجودیکہ وہ کھانا پانی کسی نے ترس کھا کر ہی بھیجا ہو پھر بھی ان سوختہ جگر مظلوموں کے لئے وہ ظلم بالائے ظلم تھا۔ کیا حضرت زینبؑ پر یہ رحم تھا۔ کیا اس کا مقصد ان کی مصیبت میں کمی کرنا تھا؟ ہرگز نہیں! زینبؑ ایک غیرت دار باپ کی غیرت دار بیٹی تھیں۔ وہ اس کی بیٹی تھیں جو ابوتراب اور ساقیِ کوثر تھا۔ وہ دنیاوی روٹی اور پانی کی بھوکی نہ تھیں۔ اور پھر یہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ سخت تر مصیبت کم تر مصیبت پر حاوی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھوک اور پیاس کی مصیبت ان کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس وقت تو ان کے ساتھ اگر کوئی ہمدردی ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ کوئی آکر بھائی کا پرسا دے اور غم کو غلط کرے۔ مگر اس کے بدلے بھائی کی لاش کو روندا جا چکا تھا۔

آب و غذا دے کر ان مصیبت زدہ پریشان حال عورتوں اور بچوں کے دلوں پر صدمہ کی ایک اور ضرب شدید پہونچائی گئی تھی۔ زینبؑ کو پانی دیکھ کر کون کون یاد آیا ہوگا۔ کون پہلے اور کون بعد میں یاد آیا ہوگا کس طرح وہ سوختہ جگر اس پانی کو دیکھ سکی ہوں گی جس کے ایک قطرہ کے لیے ننھے علی اصغرؑ کی جان گئی جس کی جد و جہد میں عباسؑ کے شانے قلم ہوئے جس کی

[1] شہید اعظم از ریاض بنارسی۔

[2] اس روایت کی تاریخی سند نہیں ملتی۔ مگر ہم نے اس کا تذکرہ کردار نگاری میں اس لئے کیا ہے تاکہ ظاہر کریں کہ اگر یہ صحیح بھی ہے تب بھی اس سے یزیدی فوج کا اہل بیت پر رحم ثابت نہیں ہوتا بلکہ ظلم ثابت ہوتا ہے۔

وجہ سے لاڈلے علی اکبرؑ کی زبان میں کانٹے پڑ گئے۔ جن کے لئے شب عاشور زینبؑ بنت علیؑ متلاشی رہیں مگر اپنی پوری بزرگانہ اور ذمہ دارانہ صلاحیتوں کے باوجود پورے خیمہ گاہ میں اتنا پانی بھی نہ پا سکیں کہ کسی چھوٹے بچہ کا حلق ہی تر کر دیتیں۔ مگر یہ پانی تو اس حق و صداقت کے عوض مل سکتا تھا جس حق و صداقت کو خواتین کربلا کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں چاہے پانی ملے یا نہ ملے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ساقی کوثر کے خاندان والے اتنے غیرت دار تھے کہ پانی جیسی حقیر چیز کو کبھی بھی دوسروں سے نہ مانگتے۔ اس قدر اصرار جو پانی کی طلب پر تھا وہ صرف اس لئے تاکہ قدرت کی عام نعمت و رحمت پر بحیثیت انسانی افراد کے اپنا استحقاق ثابت کیا جا سکے نیز اپنے موقف کی بلندی، اپنے کردار کی پختگی بطور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کی جا سکے اور یہ دکھایا جا سکے کہ حق اور اس کی حمایت کس قدر قیمتی چیز ہے۔

پس شام غریباں اہل بیتؑ کو پانی کا مہیا کیا جانا ان پر کوئی رحم و کرم نہ تھا۔ اگر علی اصغر کے لیے سوکھی زبان دکھا کر شہید ہو جانا آسان تھا تو سکینہؑ کا اب پیاسا رہ جانا سہل تر تھا۔ اگر حسینؑ کا تین شب و روز کا پیاسا شہید ہو جانا ممکن تھا تو بنت علیؑ کا اب پانی نہ پینا بھی ممکن تھا۔ میرا تو خیال ہے اور پختہ خیال ہے کہ اگر پانی کھانا بھیجا تو صرف اس لیے کہ اہل بیتؑ کو زیادہ مصیبتوں کے لئے زندہ رکھا جا سکے۔

ہم ابتدا ہی میں لکھ چکے ہیں کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جناب زینبؑ کی زندگی کا اہم ترین حصہ شروع ہوتا ہے۔

امام حسینؑ شہید ہو چکے تھے اور خواتین کربلا کی زندگی کے اہم ترین حصے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب ان معظمہ پر مظلوم و مجبور قافلہ کی پوری ذمہ داری عائد ہو گئی تھی۔ چند گھنٹوں قبل امام حسینؑ ذمہ دار تھے اور ان کی ذمہ داری میں بھی ان کی بہن شریک تھیں، اب صرف بنت علیؑ ذمہ دار تھیں مگر زینبؑ کی ذمہ داری میں حسینؑ شامل نہ تھے۔ ثانیٔ زہرا جناب زینبؑ کبریٰ کا عمل تین حیثیتوں سے ذہن کو اپنی طرف خصوصی طور پر متوجہ کرتا ہے۔ اول تو یہ عورت تھیں اس لئے ان کے لیے حالات کا مقابلہ زیادہ دشوار تھا۔ دوسرے یہ کہ چند گھنٹوں میں قتل ہو جانے کے مقابلہ میں جناب زینبؑ کے لئے تشہیر و شماتت کی تکلیف زیادہ سخت تھی اور تیسرے یہ کہ امام حسینؑ کے امتحان میں ان کی ہمت بڑھانے کے لیے زینبؑ جیسی بہن موجود تھیں، ان کے حوصلوں میں جوش پیدا کرنے کے لیے ایک شریک کار مدینہ سے کربلا تک ساتھ تھیں جب کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد سب کام خاتون کربلا کو خود انجام دینا تھا۔ اگر عابدؑ بیمار موجود بھی تھے تو ان کی صحت کی خرابی اس درجہ تھی کہ ان کا وجود جناب زینبؑ کی ذمہ داریوں میں اضافہ کا باعث بن گیا تھا کیونکہ منجملہ دیگر فرائض کے ایک کام معظمہ کے سپرد یہ بھی تھا کہ عوام الناس کو حکم امام کی اہمیت پہنچوائیں اور یہ کہ بیمار امام کی زندگی کی حفاظت فرمائیں۔ ان دونوں فریضوں کی انجام دہی کی ایک ایک مثال شام غریباں کے بیان میں گزر چکی ہے۔ ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ کس طرح جناب زینبؑ نے جلتے خیمہ سے باہر نکلتے ہوئے اپنی بے پردگی کو شرعی طور پر دینی مصلحت کے مطابق ثابت کرنے اور اپنے موقف پر امامت کی مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے امام زین العابدینؑ سے جلتے ہوئے خیمہ سے باہر نکلنے کی اجازت لی تھی۔ اس کے بعد امام کی حفاظت کا فرض بھی آپ نے انجام دیا جو ہر غیر امام پر عائد ہوتا ہے۔ آپ نے جناب سید سجادؑ کو جلتی آگ سے باہر نکال کر حجت خدا کی حفاظت فرمائی۔

[redacted]

شام غریباں ختم ہوئی اور گیارھویں کی رات کی تاریکی نے محرم پردہ مخدرات عصمت و طہارت کے پردہ کا سامان مہیا کر دیا۔ اس رات میں ظالم لشکر اپنی فتح کی خوشی میں سرمست رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے بچوں اور عورتوں کو مظالم سے چند گھنٹوں کے لیے نجات مل گئی تھی۔ اس سہمے ہوئے قافلہ کے لیے یہی بہت تھا کہ کوئی انھیں نہ ستائے اور کچھ دیر

تک کے لیے ہی سہی ان کو اطمینان و سکون سے رہنے دیا جائے۔

یہ وہ موقع تھا جب نہ امام حسینؑ تھے نہ حضرت عباسؑ نہ جناب علی اکبرؑ تھے نہ حضرت قاسمؑ نہ جناب عون و محمدؑ تھے نہ عقیل کے لال۔ اب ان سب کی نمائندگی علیؑ کی لاڈلی، شیرِ خدا کی بیٹی اور سیدہ کی لختِ جگر کر رہی تھی۔ چنانچہ کتابیں لکھتی ہیں کہ ایک جلی ہوئی قنات کے سہارے اہلِ بیتؑ ایک مقام پر آرام کر رہے تھے اور خواتینِ کربلا آنے والے نامعلوم مگر ہولناک مستقبل کے خیال کو ذہن میں لئے اس لٹے ہوئے قافلہ کی اس طرح حفاظت کر رہی تھیں جس طرح شیرنی اپنے بچوں کی حفاظت کرے یا سپاہی اپنے خزانے کی۔[۱] لکھا ہے کہ آپ برابر ٹہلا کرتی رہی تھیں۔"

اس رات میں ہوا کی ہر جنبش اور پاؤں کی ہر آہٹ قلب کو دہلانے کے لیے کافی تھی۔ ذہن تصور سے عاجز ہے کہ کیونکر حضرت زینبؑ اس رات کو گزار سکی ہوں گی۔ گزشتہ رات بھرا گھر موجود تھا۔ اس وقت تمام مرد ختم ہو چکے تھے۔ کل رات تک خیمے تھے اور ان میں عبادتوں کی بھنبھناہٹ۔ آج کی رات ننھے ننھے بچوں کے نالے اور شیون و شین۔ پتھر کا جگر ہوتا تو وہ بھی آج خون ہو جاتا۔ مگر علیؑ کی بیٹی آج اپنے فرائض کا پوری شدت کے ساتھ احساس کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے حواس باختہ نہیں کئے بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ فرائض انجام دیئے۔

[illegible] مظالم کی شکار بنی ہوئی تھیں [illegible] کی بلندی انسانی قلب کو ہرا دینے کے لیے کافی تھی اور دوسری طرف وہ [illegible] نامعلوم مستقبل جن پیش آنے والے تھے اور جن کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا۔ جنابِ زینبؑ جانتی تھیں کہ دشمن کے پاس بے انتہا مادی طاقت ہے۔ انہیں اپنی بے کسی اور لاوارثی کا بھی علم تھا۔ ان کو اس کا بھی احساس

تھا کہ اس لاوارث قافلہ کی وہ ذمہ دار ہیں۔ ایک باسلیقہ ادراک رکھتے ہوئے وہ یقیناً اندازہ کر سکی ہوں گی کہ فاتح لشکر ان پر اور ان کے قافلہ کے ہر فرد پر ہر وہ ظلم روا رکھے گا جو اس عظیم مادی قوت کے بل بوتے پر اس کے امکان میں ہے۔ بظاہر اس قسم کا امکان تھا بھی کیونکہ دشمن کو اخلاق و انسانیت کا قطعاً پاس نہ تھا اور درندگی اس قوم کی فطرت بن چکی تھی۔ اس احساس کے بعد بھی اپنے روحانی مسلک پر قائم رہنا اور ذمہ داریوں سے نہ گھبرانا کچھ ناقابلِ یقین سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر تاریخیں گواہ ہیں کہ کس جرأت و ہمت کے ساتھ خواتینِ کربلا شدید ترین مظالم برداشت کرنے کے لیے تیار تھیں۔ ناظرین غور کریں کہ مخدومہ کا کردار اس موقع پر کس قدر ارفع ہو جاتا ہے جب کہ ان کو آج کے معرکہ میں سخت ترین مصائب دیکھ کر دشمن کی مادی طاقت کا علم ہو چکا تھا مگر باوجود اس کے وہ اپنی روحانی طاقت کے بھروسے پر اور اپنے مسلک کے لوجہ اللہ ہونے کی بنا پر نہایت ہی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

غرضکہ یہ رات گزر رہی تھی مگر کسی قدر سکون کے ساتھ۔ تاریخیں نہیں بتاتیں کہ اس رات میں بادۂ فتح و ظفر سے سرشار اشقیا نے اہلِ بیتؑ اطہار پر کوئی مزید ظلم کیا ہو۔ شاید مظالم کے انبوہ میں یہ کسی قدر سکون کے لمحات اس لئے تھے تاکہ خواتینِ کربلا کا احساسِ ذمہ داری آنے والے واقعات کے لئے کچھ پختہ ہو لے ـــــ تاکہ حسینؑ جیسے بھائی کے قتل (جو عظیم مصیبت تھی) اور بے پردہ تشہیر (جو عظیم تر مصیبت تھی) کے درمیان مخدومہ کو کچھ وقت شعوری طور پر غور و فکر کے لئے مل جائے۔ یا پھر یہ مہلت اس لئے ملی تھی کہ دشمن کی فوج خود ظلم کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ایک طرف ظلم کی تھکاوٹ اور دوسری طرف اقدام و آرام کے تصور کے بوجھ نے غالباً انھیں گہری نیند میں ڈبو دیا تھا۔ بہرکیف محرم کی گیارہویں رات کو ان ستم رسیدہ لاوارثوں کو سکون نصیب ہوا تھا۔ ۱۱ر محرم کی صبح سے مصیبتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع

[۱] یہ کم درجہ کی تشبیہ ہم نے ان کی جرأت اور حوصلہ کے اظہار کے لئے مجبوراً استعمال کی ہے ورنہ ان کی جرأت بے مثال تھی۔

ہواجوں کا شکار یہ پورا قافلہ ہی تھا۔ مگر بالخصوص یہ مصائب خاتونِ کربلا سے متعلق تھے۔ فی الحال لاوارث اہل بیتؑ کو ابن زیاد کے دربار میں حاضر ہونا تھا۔ اہل بیت رسولؐ کو قید کیا گیا۔ ننھے ننھے بازو اور گلے رسیوں میں باندھے گئے۔ محترم اور معزز گھرانے کی باعصمت عورتوں کو رسیوں میں کسا گیا۔ بیمار امام کے گلے میں خاردار طوق پہنایا گیا اور ننگے اونٹوں پر سوار کرکے اس قافلہ کو کوفہ کی طرف لے جایا گیا۔

تاریخوں میں ہے کہ کربلا سے کوفہ چلتے وقت یہ قافلہ اس میدان سے بھی گزرا جہاں امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و اعزا کے بے گور و کفن لاشے پڑے تھے۔ جناب زینبؑ پر شہدا کے لاشوں کو دیکھ کر کیا گزری اس کے احساس کے لئے چند امور کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جناب زینبؑ اس کی نواسی تھیں جو شارعِ اسلام تھے اور جنھوں نے دفن و کفن کے اصول و ضوابط مقرر کئے تھے۔ موصوفہ اُن حسینؑ کی عزیز ترین بہن تھیں جن پر آپ نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچے قربان کر دیئے تھے۔ خاتون کربلا خود ایک انسانی قلب رکھتی تھیں۔ مظالم کا انبوہ دیکھتے دیکھتے ان کا قلب فطری طور پر بہت نازک ہو چکا تھا۔ اب اندازہ کیجئے اس سوختہ جگر بہن نے دیکھا کہ شارعِ اسلام کا نواسہ ریگ کربلا پر بے گور و کفن پڑا ہے جب کہ دشمن کا ہر لاشہ خواہ وہ کتنے ہی ذلیل سے ذلیل تر شخص کا ہو دفن کیا جا چکا ہے۔

بنتِ علیؑ کے لئے امام مظلومؑ کی لاش ـــــ اور برہنہ لاش ـــــ یقیناً ناقابلِ برداشت رہی ہوگی۔ خاتون کربلا یا جناب ام کلثومؑ کی جگہ اس طرح محبت کرنے والی دوسری بہن اس منظر کو دیکھ کر زندہ بھی نہ رہ سکتی تھی۔ معظمہ نے دیکھا کہ بھائی کے جسم پر وہ بوسیدہ لباس بھی نہ تھا جس کو بھائی نے بڑے اہتمام سے رخصت کے وقت زیب جسم فرمایا تھا "تاکہ وہ لوٹ سے محفوظ رہ جائے"۔ خدا معلوم امام کی بہن نے کن آنکھوں سے بھائی کی برہنہ لاش کو دیکھا اور کس دل سے صبر کیا اور کس عقل سے اپنے فرائض کو انجام دیا۔ تاریخی سند سے پتہ چلتا ہے کہ اس مصیبت پر امام زین العابدینؑ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس موقع پر پھر امام کی غیر امام پھوپھی اور معصوم کی غیر معصوم سرپرست آگے بڑھیں فرمایا۔ "اے یادگار برادر تم کو کیا ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے روح پرواز کر جائے گی"۔ اس وقت امام کو غیر امام نے اور جوان مرد بھتیجے کو ضعیفہ پھوپھی نے صبر کی تلقین کی۔ ناظرین کو یاد رہے کہ اس تلقین کے وقت خود حضرت زینبؑ کے سامنے بھی وہ روح فرسا منظر تھا۔ ہم برابر معظمہ کے کردار میں یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مصائب کو پورے احساس کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے آپ مختلف النوع فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے رہی تھیں جو کسی بھی مرد یا عورت کے لئے اُن نازک حالات میں سخت مشکل کام تھا۔

تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہے مگر نفسیات کے اصول تسلسل[1] یا PSYCHOLOGICAL LAWS OF ASSOCIATION کے مطابق آج کربلا سے رخصت ہوتے وقت یقیناً بنت علیؑ کی آنکھوں میں وہ منظر بھی پھر گیا ہوگا جب کربلا میں اہل بیتؑ کا قافلہ وارد ہوا تھا۔ عباسؑ کا وہ شعلہ اور جناب سید سجادؑ کی وہ ولولہ خیز جوانی کا جوش یاد آیا ہوگا جو علقمہ کے کنارہ

---

[1] ارسطو کے زمانہ ہی سے علم نفسیات کا یہ ایک خاص فکری مسئلہ رہا ہے کہ کسی ایک شے کا مشاہدہ یا تجربہ کیونکر ذہن کو کسی غیر موجود چیز کے تصور کی طرف لے جاتا ہے اور اس طرح کس اصول کے ماتحت ہم باتوں کو یاد کرتے ہیں۔ ارسطو نے اس سلسلے میں تین اصول قائم کئے تھے۔ جب ان تین میں سے کوئی ایک یا تمام رشتے دریافت شدہ شے اور یاد آنے والی شے کے درمیان ہوتے ہیں تب ایک شے دوسری شے کی یاد دلانے کی محرک ہوتی ہے۔ وہ تین رشتے یہ ہیں۔ یکسانیت (SIMILARITY) متضاد یا ضدیت (CONTRAST) اور دو تین کا اتفاق یا دو چیزوں کا ساتھ ساتھ واقع ہوتا (CONTIGUITY OR TOGETHERNESS) یہ اتفاق جگہ اور وقت دونوں کا ۴۴

سے خیموں کے ہٹنے کے سلسلے میں انھوں نے دیکھا تھا۔ پھر جب ان کے ادراک نے ان حالات کا موجودہ ماحول سے تقابل کیا ہوگا تو ان پر کیا گزری ہوگی اس کا احساس تو بڑی بات ہے تصور بھی محال ہے۔ کیا تعجب کہ کربلا سے روانگی کے وقت زینبؑ بنت علیؑ کا سلسلہ یادداشت مدینہ سے روانگی کے منظر تک پہونچا ہو، جب محمل میں سوار ہونے کے لیے حسینؑ، عباسؑ اور علی اکبرؑ سب مل کر بنت علیؑ کے پردہ کا انتظام کر رہے تھے ——— مگر ان سب یادوں کے باوجود آج علیؑ کی بیٹی کو ایک مہم سر کرنی تھی جس پر وہ روانہ ہو رہی تھیں۔ آج انھیں وہاں جانا تھا جہاں بظاہر قیدی ہوتے ہوئے بہ باطن حکومت کرنا تھی جہاں انھیں بظاہر مفتوح بھائی کے موقف کی صداقت کا کلمہ پڑھوانا تھا لہذا ان چھوٹے چھوٹے احساسات کو اور مصیبتوں کو خاتون کربلا نے کچھ اہمیت نہ دی ہوگی وہ بخوشی اسیر ہوئیں اور صبر کی قوت کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کر کے کوفہ کی مہم پر چل پڑیں۔

کربلا سے کوفہ کی مسافت چند میل کی ہے۔ حضرت زینبؑ اور ان کا قافلہ ۱۲ سے ۱۳ر محرم تک کوفہ پہونچ گیا ہوگا۔ یعنی جب یہ قافلہ پہونچا تب تک گزرے ہوئے مظالم بالکل تازہ تھے اور آنے والے مظالم اسی ایک سلسلے کی کڑیاں تھے اور پھر یہ مظالم تو ایسے تھے کہ کتنا ہی وقت گزرنے کے بعد بھی تازہ رہے۔

خاتون کربلا اس کوفہ میں قید کر کے لائی گئی تھیں جو ان کے باپ کا دارالحکومت رہ چکا تھا اور جہاں وہ دین و دنیا کی شہزادی بن کر کئی برس گزار چکی تھیں۔ بالعموم ذاکرین اور مصنفین اس امر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں مگر ہمارے خیال میں یہ کوئی زیادہ اہم بات نہ تھی کہ وہ اسی کوفہ میں قیدی بن کر آرہی تھیں جس میں وہ شہزادی بن کر رہ چکی تھیں۔ زینبؑ تو علیؑ جیسے مدبر کی بیٹی تھیں اور اپنی شعوری عمر کا کافی حصہ خود کوفہ میں گزار چکی تھیں۔ وہ اس سے اچھی طرح واقف تھیں کہ کوفہ کی مخلوط آبادی میں ان کے اور اولاد علیؑ کے مخالف عناصر کس قدر ہیں۔ پس ان کو اندازہ پہلے سے رہا ہوگا اور محکوم کوفیوں کا قیدی بن جانا صاحب شعور بنت علیؑ کے لیے غیر معمولی اور امید کے برخلاف سانحہ کی حیثیت ہرگز نہ رکھتا تھا۔ جناب زینبؑ نے کوفہ میں جس مستقل مزاجی سے امور کو انجام دیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کوفہ میں داخلہ کے لئے بنت علیؑ کا شعور یقیناً ان کو یہاں آنے کے لئے تیار کر چکا ہوگا۔ پس جناب زینبؑ کے لیے یہ کوئی خاص مرحلہ نہ تھا کہ کس طرح کوفہ میں حواس قائم رکھتے ہوئے اور جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے داخل ہوا جائے بلکہ بنت علیؑ کے لیے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کیونکر اس مخالف ماحول میں حسینؑ کے مقصد کا نشر کیا جائے ——— کوفہ میں داخلہ تو بنت علیؑ جیسی صابرہ کے لیے بہرحال قدرے آسان تھا مگر موجودہ فضا کے لئے بھی اسی کوفہ میں حسینؑ کے مقصد کا بیج بونا یقیناً مشکل تھا جس کی ہر فرد پر حکومت وقت کا خوف اور انعام کا لالچ مسلط تھا اور جس میں حکومت کے خوشامدیوں کی اچھی خاصی تعداد بستی تھی۔ ان کے لیے یہ ایک سخت و دشوار کام تھا کہ مادی طاقت رکھنے والی حکومت اور عوام الناس سے ٹکر لیں۔ وہ بظاہر انکی ایک بات بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس فرض کا خیال جناب زینبؑ کو پریشان کر رہا ہوگا جبکی وہ ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں مگر جس کے لیے حالات بظاہر سازگار نہ تھے۔ قربان ہماری جانیں شہزادی کے اس عزم پر جسکے ساتھ آپ نے اپنے فرائض کو نبھا کر رکھا اور نازک ترین حالات میں بھی فرائض انجام دیئے۔

۴۴ ہو سکتا ہے۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ اگرچہ بالآخر اتفاق و توسع ہی ذہن کو گزشتہ تجربہ کی طرف ملتفت کرتا ہے مگر جب بلا واسطہ اور بظاہر عنصری طور پر تجربہ کی دو چیزوں میں اتفاق و توسع پذیر نہیں ہوتا تب ان دونوں میں یکسانیت اور تضاد کے عناصر ان دونوں کے درمیان ایک تخیلی رشتۂ اتفاق قائم کر دیتے ہیں۔ یہ ان تین اصولوں کے ماتحت واضح ہوتا ہے کہ ایک منظم سلسلے میں ہم کیونکر خیالات کو ذہن میں دہرا سکتے ہیں اور کیونکر چیزیں سلسلے میں یاد آیا کرتی ہیں۔ نفسیات کے مختلف اسکولوں کی تنقید کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ ارسطو کا یہ بنیادی خیال بالکل صحیح ہے۔ ان اصولوں کے تحت ناظرین کو غور کرنا چاہیئے کہ کربلا سے روانگی کے وقت حضرت خاتون کربلا کے سامنے کربلا میں ابتداء ورود اور مدینہ سے روانگی کے وقت کا منظر ضرور یاد آیا ہوگا اور انھیں شدید روحانی تکلیف پہونچی ہوگی۔

باب پنجم

کوفہ میں خاتونِ کربلا

یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ پہونچا۔ خلقت کا ہجوم چاروں طرف تھا۔ آگے شہدا کے سر تھے جو نیزوں پر بلند تھے۔ ہر فرد دشمن تھا۔ اگر کوئی دوست تھا بھی تو چھپا ہوا جس کا زینبؑ کو قطعاً علم نہ تھا۔ دنیا کا کوئی انیٹنی (ANTONY) کوئی ہٹلر یا کوئی چرچل اس ماحول میں اور اس کسمپرسی کے عالم میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکتا تھا۔ مگر تاریخیں گواہ ہیں کہ اس نازک ماحول میں اور اس بے بسی اور مصیبت زدگی کے عالم میں بھی علیؑ کی بیٹی نے بے مثل قوت گویائی دکھائی۔ دشمنوں سے بھرپور کوفہ کے بازار میں خاتونِ کربلا نے بے نظیر خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ اعلانِ حق تھا۔ یہ اپنے یوقت کا اشتہار تھا اور بھائی کا پیغام تھا ـــــ یہ خطبہ خود تاریخِ اسلام کا ایک عظیم سانحہ تھا جو کوفہ میں اُس روز ظہور پذیر ہوا۔

اس لٹے ہوئے قافلہ کا منظر عجیب دلدوز تھا کہ اس ہجوم میں بھی کچھ لوگوں پر گریہ طاری ہو گیا تھا جو بالخصوص تماشہ دیکھنے اور خوش ہونے کی غرض سے جمع ہوئے تھے۔ موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے خاتونِ کربلا کے ذمہ دارانہ ادراک کو جوش آیا اور آپ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مجمع کو نہایت پُر رعب لہجہ میں مخاطب فرمایا۔ تاریخوں میں ہے کہ جب حضرت زینبؑ بنت علیؑ نے "ایھا الناس" کہہ کر خطبہ شروع کیا تو فضا میں سناٹا چھا گیا۔ بیٹی نے باپ کے لہجہ میں تقریر کی۔ باجوں کی صداؤں، لوگوں کی گفتگوؤں، گھوڑوں کی ٹاپوں اور اونٹوں کی آوازوں، سب پر پھر خاموشی تک گئی۔ آج زینبؑ کی ایک آواز کوفہ پر حکومت کر رہی تھی جس پر ابن زیاد اپنی پوری مادی طاقت کے ساتھ بظاہر قابض تھا۔ یہ واقعہ قیامت تک گواہی دے گا کہ حق اور حق پرستوں کی طاقت کیا ہوتی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ جناب زینبؑ بنت علیؑ کے اس اہم خطبہ کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کریں کیونکہ اس سے مخطبہ کے کردار کے مختلف پہلو روشن ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خطبہ چند سیاسی و سماجی اثرات کے لئے بھی اہم ہے جو بعد میں اسی کوفہ میں رونما ہوئے اور جن کا کریڈٹ بڑی حد تک حضرت زینبؑ بنت علیؑ کو دیا جا سکتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خطبہ کے نفسیاتی اور منطقی تجزیہ سے پہلے خطبہ کو لفظ بہ لفظ نقل کر دیا جائے۔ یہ خطبہ تقریباً ہر تاریخ کی کتاب میں درج ہے:-

"حمد خدا کے لئے ہے اور صلواۃ و سلام میرے جد بزرگوار محمد مصطفیٰؐ اور ان کی عترت کے ساتھ مخصوص ہو۔ اما بعد، اے اہلِ کوفہ اور اے اہلِ مکر و دغا تم کیا روتے ہو، تمہارے آنسوؤں کو رکنا نصیب نہ ہو اور نوحہ و فریاد کی ان آوازوں میں سکون نہ ہونے پائے۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے جو اپنا تاگا مضبوط بٹ کر توڑ ڈالے۔ (یعنی مضبوط عہد و پیمان کرنے کے بعد وعدہ خلافی کرے) تم اپنی قسموں کو اپنے مکر و فریب کا حیلہ قرار دیتے ہو۔ تم حسد، بدی اور غیبت کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔ گویا تم اس چراگاہ کی مانند ہو جو گھوڑے پر ہو، یا اس چاندی کی مثل ہو جس سے کسی قبر کو سجایا گیا ہو۔ تمہارے نفسوں نے برے اعمال پیش کئے جن کے سبب سے خدا تم پر غضبناک ہے اور تم ہمیشہ عذابِ خدا میں مبتلا رہوگے۔ کیا تم

ڈرتے ہو؟ بیشک تم اسی کے مستحق ہو۔ اور جہاں تک ہو سکے کم ہنسو اور زیادہ روؤ۔ تمہارے دامن عمل پر وہ داغ ہے جسے تم دھو کر چھڑا نہیں سکتے۔ اور فرزند خاتم الانبیاءؐ کے قتل کا دھبا کیونکر دھو سکو گے؟ وہ فرزند جو سردار جوانان بہشت تھا، تمہارے لئے محل امن، تمہارے زخموں کا طبیب، تمہاری ہدایت کے لئے دلیل واضح اور تمہارا راہ نما تھا۔ تم نے بدکاری کا بہت بڑا بوجھ اٹھایا۔ خدا انہیں برباد اور ہلاک کرے۔ یقیناً تمہاری کوشش اور تدابیر ضائع ہو گئیں اور تم غضب خدا میں گرفتار اور ذلیل و خوار ہو گئے۔ اے کوفیو! تمہارا برا ہو، تم نے رسولؐ کے جگر کو چاک کر ڈالا اور ان کی محترم ذریت کو بے پردہ کر دیا۔ اور کیسی خونریزی اور بے حرمتی کی۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ آسمان سے خون برسا؟ یہ تو کچھ نہیں۔ آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ شدید ہوگا اور اس وقت تمہارا نہ کوئی معین ہوگا اور نہ مددگار۔ اس چند روزہ مہلت پر مغرور نہ ہو، خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس کو نہ موقع نکل جانے کا خوف ہے اور نہ جہنم کی ہنگامہ آرائی کا اندیشہ۔"

سب سے پہلی بات جو اس خطبہ میں قابل غور ہے وہ یہ کہ یہ سخت ترین الفاظ ایک سخت ترین مخالف مجمع میں کہے گئے تھے۔ اور یہی نہیں کہ مجمع نے صرف اس خیال سے سن لئے ہوں کہ ایک عورت بول رہی ہے بولنے دو، بلکہ خطبہ کی لفظیں ان افراد انسانی کے دلوں میں حقیقتاً اتر آئی تھیں۔ وہ سب انتہا درجہ تک ان سے متاثر ہو رہے تھے۔ تبھی تو سب کے سب دم بخود سسکتے کے عالم میں تھے۔

تب ہی تو یہ ہوا کہ جب خاتون کربلا نے خطبہ ختم کیا تو لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اسی لئے تو ایسا ہوا کہ چند لوگ باوجود ابن زیاد کی تمام تر سیاست کے اہلبیتؑ کے حق میں الفاظ زبان پر جاری کر بیٹھے تھے۔

جیسا کہ پہلے اشارتاً کہا گیا ہے اس سخت معاندانہ ماحول میں جناب زینبؑ کو فن خطابت کی بڑی دشواریوں کا سامنا تھا۔ تمام فنی پہلوؤں سے قطع نظر آپ غور فرمائیے۔ شیکسپیئر کے فرضی کردار انیٹنی[1] (ANTONY) کے پیش نظر بھی ایسا نازک ماحول نہ تھا جیسا جناب خاتون کربلا کے روبرو تھا۔ مناسب ہوگا اگر بنت علیؑ کے ماحول کا انیٹنی کے ماحول سے تقابل کیا جائے۔ بے شک دونوں کو سخت دشمن ماحول سے سامنا تھا اور دونوں کے لئے مرحلہ یہ تھا کہ مقتول کے لئے قاتل مجمع سے ہمدردیاں حاصل کی جائیں۔ لیکن انیٹنی کا مخاطب مجمع صرف اس کا سیاسی مخالف تھا۔ اس میں انیٹنی کے بھائی بیٹے، بھتیجوں اور بھانجوں کے قاتل نہ تھے۔ چنانچہ ایسے مخالف مجمع سے تخاطب کرتے وقت خطیب کو کوئی خاص دقت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر ہمارا سلام علیؑ کی بیٹی پر جنھوں نے اس مجمع کے سامنے معرکۃ الآراء تقریر فرمائی جس میں ان کے بھائی کا قاتل شمر شقی اپنے دوستوں کے ساتھ موجود تھا جس میں ابن سعد جیسا فتنہ پرور پوری تمکنت کے ساتھ ہمراہ تھا جس میں حرملہ اپنی کمان کے ساتھ کھڑا ہوا تھا جس میں علی اکبرؑ، قاسمؑ، عون و محمدؑ اور زینبؑ کے سب ہی لاڈلوں کے قاتل اپنی تمام انسانیت سوز اور حیوان نما صلاحیتوں کے ساتھ موجود تھے۔ کیا یہ مجمع اس خطیب کی آواز سننا گوارا کرے گا؟ یہ تو خیر بعد کی بات تھی۔ اول تو خود ایسے مظلوم شخص کی عام اصول کے مطابق ہمت ہی نہیں پڑ سکتی کہ وہ ایسے مجمع کو مخاطب کرے۔

---

[1] انگلستان کے مشہور ڈرامہ نویس شیکسپیئر نے اپنے ڈرامہ جولیس سیزر (JULIUS CAESAR) میں انیٹنی کا ایک کردار پیش کیا ہے۔ انیٹنی سیزر بادشاہ (قیصر روم) کا خاص وزیر ہو۔ سیزر کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔ سیزر مارا جاتا ہے۔ باغی لوگ سیزر کی لاش کو منظر عام پر عبرت کے لیے رکھتے ہیں۔ انیٹنی مقید ہو کر آتا ہے۔ بروٹس جو باغیوں کا سردار اور سیزر کا باغی وزیر ہے اپنی فاتحانہ تقریر میں بغاوت کے اسباب اور مقاصد کو بیان کرتا ہے۔ پورا مجمع سیزر اور انیٹنی کا مخالف ہے۔ انیٹنی (ANTONT) بلا کا مقرر ہے۔ انیٹنی جب اسٹیج پر بولنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنی قوت تقریر سے اپنے خلاف مشتعل مجمع کو اپنے حق میں لے لیتا ہے۔ وہ مجمع

ایسے موقع پر اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے عقل کی باتیں کرنا جو مجمع کے اوپر اثر انداز ہو سکیں واقعی بے انتہا قابلِ تعریف بات ہے اور خاتونِ کربلا اس تعریف کی مستحق تھیں۔ انھوں نے واقعی ایک مشاق خطیب کی شان دکھائی جب کہ وہ ایسے مجمع سے مقابلہ کر سکیں۔ ضرور بالضرور شیکسپیر نے حدودِ انسانی سے اس کو بعید سمجھا تھا ورنہ وہ کبھی انیٹنی کے مخاطب مجمع میں انیٹنی کے رشتہ داروں

جو چند لمحہ پہلے سیزر کے قتل کے حق میں تھا اب انیٹنی کی تقریر کے بعد سیزر کے قاتلوں سے قصاص لینے اور انھیں قتل کرنے کے درپئے ہو جاتا ہے۔

گوکہ یہ ایک تاریخی امرِ واقعہ ہے کہ اس طرح سیزر (قیصر) کے خلاف بغاوت ہوئی اور پھر اس کے وزیر نے باغیوں کو زیر کر لیا۔ مگر ڈرامہ نویس شیکسپیر نے اپنی قوتِ تحریر اور تخیل سے انیٹنی کی تقریر کو بے مثل زبان میں قلمبند کیا ہے۔ شیکسپیر کے ڈرامہ "جیولیس سیزر" میں انیٹنی کی یہ تقریر فنِ خطابت کی اپنی آپ مثال ہے۔ درحقیقت اس دور میں روم کا تمدن اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ فنِ خطابت کے لطیف نفسیاتی نکتے تقریر میں لائے جاتے، یہ دراصل شیکسپیر کے آفاقی تخیل کی خوبی ہے۔ چنانچہ جیولیس سیزر کا انیٹنی تاریخ کے انیٹنی سے بہت مختلف ہے۔

ہم نے اوپر کی سطروں میں یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ شیکسپیر کو گوکہ ہر طرح کی آزادی تھی کہ اپنی فرضی تخلیق میں حالات کو جتنا چاہے بدل دے۔ پھر بھی وہ جن فرضی حالات میں انیٹنی کو اسٹیج پر لاتا ہے وہ بہرحال اتنے سخت نہیں تھے جتنے سخت حالات سے ثانیِ زہرا خاتونِ کربلا کو سابقہ تھا۔ جنابِ زینبؑ کا یہ بے مثل کارنامہ تھا کہ وہ حقیقی طور پر ان حالات کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کرنے میں کامیاب ہوئیں جن کا تصور ایک ڈرامہ نویس کے تخیل میں بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر اسکے تخیل میں امکان ہوتا تو یقیناً وہ اپنے طربیہ ڈرامہ (ٹریجڈی) کے حسن و جمال کو بڑھانے کے لئے اس قسم کا ماحول انیٹنی کے سامنے پیش کرتا جو کسی منفرد انسان کے لیے قابلِ برداشت ہو سکتا ہو اور جس میں وہ کسی طرح بھی کامیاب ہو سکتا ہو۔

کے قاتلوں کو پیش کرتا۔

اور پھر یہ ایک عام اصول ہو کہ ذاتی دشمنی میں انسان عقل کھو بیٹھتا ہے اور اپنے مخالف سے کچھ بھی اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ دنیا کے ریفارمر اس حقیقت کی اصلاح میں چاہے کتنے ہی ورق سیاہ کرتے رہیں مگر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اس نفسیاتی کمزوری کے شکار ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ بہرکیف عوام جو مجمع کثیر یا ہجوم اور بھیڑ کی شکل میں آکر اپنے اصلاحی ادراک REFORMATIVE INTELLIGENCE کو کھو بیٹھتے ہیں یقیناً اس نفسیاتی کمزوری کے شکار ہوتے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیے شیکسپیر کے ڈرامہ میں انیٹنی کا مخالف مجمع اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں رکھتا تھا۔ وہاں تو صرف اصولی مخالفت تھی۔ اصولی مخالفت کو ختم کرنا بہت آسان ہے، وہاں ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ ٹھنڈے سے صبر کے ساتھ بات کہی جائے اور کسی طرح مجمع کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے یہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں شیکسپیر کے تخیل کو ہم اتنا ہی کریڈٹ دے سکتے ہیں کہ اس کے کردار نے یہ کام ذرا جلدی یعنی صرف ایک ہی تقریر میں کر لیا۔ دوسرا کوئی ہوتا اس کو شاید بغاوت کو دفع کرنے میں کچھ دیر لگتی۔ بہرکیف اس قسم کے مخالف مجمع کو اپنے حق میں کر لینا ایک مقرر یا خطیب کے لیے آسان نہیں تو ناممکن بھی نہ تھا۔ اب ذرا خاتونِ کربلا کے مخاطب مجمع کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ کیجئے۔ بنتِ علیؑ کے سامنے وہ مجمع تھا جو ذاتی طور پر حضرت زینبؑ کا اور ان کے خاندان بھر کا دشمن تھا جو بظاہر اسی اصول پر کاربند تھا جس کے علمبردار زینبؑ کے گھرانے والے تھے۔ یہاں پر جناب زینبؑ اصولی بحث کر کے یہ آواز نہیں بلند کر سکتی تھیں کہ "جس اصول پر تم کاربند ہو وہ اصول غلط ہے"۔ اور نہ ان کا کام اس سے چل سکتا تھا کہ اپنے اصول کی خوبیوں دلائل پیش کر کے ان کے ادراک سے داد حاصل کرتیں۔ یہ مجمع خطیب کے خلاف ذاتی طور پر مشتعل کیا گیا تھا اور ان جذبات پر قابو حاصل کرنا بڑے سے بڑے مقرر کے بس کا

کام نہ تھا۔ اس مجمع کے غصہ کو کم کرنا ہی مشکل تھا۔ چہ جائیکہ اس کو اپنے حق میں کر لینا مزید مظالم سے بچنے کے لئے مجمع کے غصہ کو فرو کرنے کی بھی بس اک صورت یہی ممکن تھی کہ مقرر معافی مانگ لے اور گزشتہ باتوں پر ندامت ظاہر کرے۔ مگر ہزاروں درود خاتونِ کربلا پر کہ انھوں نے اپنی خودداری کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور بڑی متانت کے ساتھ مخالف اور دشمن مجمع کو خود اس کے کئے ہوئے اعمال پر نادم کیا۔ جناب زینبؑ بنت علیؑ کا یہ کارنامہ علم نفسیات کے ماہرین کو مجبور کر رہا ہے کہ انسانی نفسیات کے اصولوں میں تبدیلی کریں۔ واقعی خاندان رسالت کی فردیں دنیاوی اصولوں سے بالاتر ہوا کرتی ہیں اور بظاہر مافوق البشر معلوم ہوتی ہیں۔ تاریخیں گواہ ہیں کہ زینبؑ بنت علیؑ نے کوفہ کے اس دشمن مجمع میں تقریر کی اور تقریر کے بعد اہل بیتؑ کے حق میں آوازیں سنی گئیں۔ یزید اور یزیدیت کے خلاف جو منظم تحریک بعد میں اٹھی تھی اس میں جنابِ خاتونِ کربلا کی اس تقریر کا اچھا خاصہ حصہ ہے۔ خاتونِ کربلا نے اس روز ان دلوں کو پانی کیا تھا جن کو اہل بیتِ رسولؐ کی دشمنی نے پتھر بنا دیا تھا۔ آپ نے اپنے خاندان سے ذاتی عناد رکھنے والے مجمع کو اپنا مداح بنا لیا تھا۔ تاریخیں گواہ ہیں کہ خطبہ سننے کے بعد جب مجمع کا سکوت ٹوٹا تو چند آوازیں اہل بیتؑ کی عظمت کا اعتراف کرتی ہوئی سنی گئیں، اور کچھ لوگوں کی آنکھوں سے ندامت و خلوص کے آنسو گرتے دیکھے گئے۔ لاکھوں درود خطیب اعظم کی اس اعجاز بیان پر۔

خطبہ کے ایک ایک جملہ پر غور کیجئے۔ فصاحت اور بلاغت کے پہلو سے قطع نظر (جو عربی زبان میں ہی اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے) کر کے دیکھئے اس میں کیسے کیسے نفسیاتی اور منطقی نکتے نظر آتے ہیں۔

پیغمبرِ اسلام نے خطابت کا ایک اصول بنایا تھا اور اس کو ہر وہ خطیب اپناتا تھا جو مسلمان ہونے کا دعویدار ہوتا۔ جناب زینبؑ نے بھی اسی طرح خطبہ شروع کیا۔ یعنی سب سے پہلے خدا کی حمد پھر پیغمبرؐ کی رسالت کی گواہی۔ یہاں پر علاوہ اس سنتی اہمیت کے ان ابتدائی فقروں کا ایک اہمیت یہ بھی تھی کہ جناب زینبؑ گویا شروع میں ہی اعلان فرما رہی تھیں کہ "ہمارا اور تمہارا مسلک ایک ہے۔ اگر تمہیں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ایک خروج کرنے والے کے خاندان والے ہیں جس نے خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کی تھی تو تم اب اس غلط فہمی میں نہ رہو۔" خاتونِ کربلا اپنے طرز خطابت سے اعلان کر رہی تھیں کہ "ہم بھی اسی دین کے ماننے والے ہیں جو تمہارا دین ہے۔" پھر صلوٰۃ و سلام میں پیغمبرؐ کے ساتھ ان کی آل کو بھی شامل کرتی ہیں تاکہ بھولے ہوئے دماغوں میں یاد تازہ ہو جائے کہ آلِ محمدؐ پر صلوٰۃ بھیجنا انسان تو انسان فرشتوں تک پر واجب ہے[۵]۔ اور انھیں اہلبیتِ رسولؐ پر وہ مسلمان ہوتے ہوئے یہ مظالم کر رہے تھے۔

ان ابتدائی فقروں کے بعد خطبہ ایک اہم ترین رُخ لیتا ہے خاتونِ کربلا مجمع کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو پیدا کرتی ہیں اہلِ کوفہ کی رگ و ریشہ سے واقف تھیں۔ ان دل جلی اور فلک ستائی معظمہ نے اپنے جانی دشمن کے ان نقائص کا اعلان کھل کر کیا جو قتلِ حسینؑ کے موجب تھے۔ علاوہ بنتِ علیؑ کے کسی کا یہ بتہ نہ تھا جو اس دشمن مجمع سے اتنا کہہ سکے۔ خاتونِ کربلا نے نہایت جوش و بے خوفی سے کوفہ والوں کو ان کے وعدے یاد دلائے اور اہلِ کوفہ کو ان کے منھ پر وعدہ خلافت، مکار و غدار ثابت کیا۔

زینبؑ جانتی تھیں کہ یہ مجمع بہرحال نام نہاد مسلمانوں کا تو ہے ہی گو کہ ان کے قلبوں پر مادی طاقت نے باطل کی مہریں لگا دی ہیں۔ حجتِ حق کی بیٹی نے حجت تمام کرنے انھیں شرمندہ کرنے اور اپنے موقف کی حقانیت ثابت کرنے کی غرض سے ان لوگوں کو قرآت

---

[۵] قرآن کی آیت ہے :- ان اللہ وملٰئکتہٗ یصلون علی النبی طیا ایہا الذین آمنو صلو علیہ وسلمو تسلیما (ترجمہ :- بیشک خدا (اور فرشتے پیغمبرؐ (اور ان کی آل) پر درود بھیجتے ہیں — — — — — — — — — تو اے مسلمانوں تم بھی درود بھیجتے رہو اور برابر سلام کرتے رہو۔

اس آیت کی تفسیر میں آنحضرتؐ کی حدیث ہے کہ مجھ پر دم بریدہ سلام نہ بھیجا کرو اور ہمیشہ میری آل پر بھی سلام بھیجا کرو۔ گویا نصوص کی بنا پر حضرت نبیؐ اکرم اور ان کی اولاد پر درود بھیجنا اور عزت کے ساتھ یاد کرنا ہر مومن پر واجب ہے اور ہر مسلم کے لیے معیار کردار و عمل ہے۔

کی بھی یاد دلائی اور واضح فرمایا کہ تمہارا ذلیل فعل تم کو قیامت میں رسوا کر دے گا۔ خاتونِ کربلا ان کے سامنے ان کے عمل کی پستی، مقتول کی افضلیت اور شرف اور بے خطا ہونا واضح کر کے ظاہر فرماتی ہیں کہ ایسے حالات میں یہ قابلِ شرم فعل کس حد تک سخت عذاب و سزا کا موجب ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

"تمہارے دامنِ عمل پر وہ داغ ہے جسے تم دھو کر چھڑا نہیں سکتے۔ اور فرزندِ خاتم الانبیاءؐ کے قتل کا دھبّا کیونکر دھوؤگے؟ وہ فرزند جو سردارِ جوانانِ جنت تھا، تمہارا جائے پناہ، تمہارے لئے محلِ امن، تمہارے زخموں کا طبیب، تمہاری ہدایت کے لئے دلیلِ واضح اور تمہارا راہنما تھا، تم نے بدکاری کا بہت بڑا بوجھ اٹھایا۔"

معظمہ بیان فرماتی ہیں کہ اہلِ بیتؑ کی بے پردگی مسلمانوں کے رسولؐ کے قلب کے لئے کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ ابنِ زیاد کی تہاریت نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ ضرورت صرف اس کی تھی کہ ان کے دلوں کو جھنجھوڑ کر ایک مرتبہ پھر سوچنے کی دعوت دی جائے کہ جو انھوں نے کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ رسولؐ کی نواسی نے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور بڑی خوبی کے ساتھ اس کو پورا کیا تھا۔ ہر مسلمان کا دل ان اخلاقی اور مذہبی ٹھوکروں پر حق کی حمایت میں پسیجنا چاہیئے تھا اور ایسا ہی بڑی حد تک ہوا بھی۔

اس سب کے باوجود ممکن تھا چند لوگوں کے ذہن میں حکومت کے پروپگنڈے کے مطابق یہ سوال پیدا ہوتا کہ اگر زینبؑ اور حسینؑ حق پر تھے تو ان کو بظاہر مصائب اور شکست کا سامنا کیوں کرنا پڑا۔ اس وقت معظمہ اس کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔ اپنے موقف کے برحق ہونے کی مکمل تشریح تو ابنِ زیاد کے دربار میں حاکم کے روبرو ہوگی۔ مگر یہاں بھی ایک عام شبہ کو دور کرنے کے لئے فرماتی ہیں :-

"اس چند روزہ مہلت پر مغرور نہ ہو۔ خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں اس لئے کہ نہ اس کو موقع نکل جانے کا خوف، نہ ہی حکم کے ٹل جانے کا اندیشہ!"

اس خطبہ کے بغور مطالعہ سے ایک یہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ خطبہ میں غیر ضروری الفاظ کی بھرمار نہیں ہے جو بالعموم پبلک تقریروں کو موثر بنانے کے لیے ضروری بھی ہوتی ہے کیونکہ مجمع کثیر کی نفسیات یہ ہے کہ وہ ہر لفظ پر غور و خوض نہیں کیا کرتا۔ اس کے نفسیاتی تقاضے جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات کی لہروں میں بس کچھ چبھتے ہوئے الفاظ کام کر جاتے ہیں۔ اسی لئے جذباتی فقروں کا بار بار دہرانا ضروری ہو جاتا ہے۔[۵۱] اس اعتبار سے گویا جنابِ زینبؑ کے بیان بحیثیت مقرر کے یہ نقص ہو سکتا تھا کہ اس میں جذباتی [redacted] جملے نہ تھے۔ مگر جیسا ہم ابھی گزشتہ سطروں میں بیان

---

۵۱ یہاں پر ضروری ہے کہ ہجوم و مجمع کے نفسیات 'SYCHOLOGY OF CROWD' پر مختصر معلومات فراہم کر دی جائیں۔ فرد جب مجموعی طور پر بھیڑ یا جمِ غفیر کا ممبر بن جاتا ہے تب اس کا عمل انفرادی حیثیت میں رہتے ہوئے ممکن عمل سے بالکل ہی مختلف ہوتا ہے کوئی مجمع جمِ غفیر (CROWD) تب بن جاتا ہے جب اس کے تمام افراد کا ذہن ایک جاذبِ نظر چیز اور توجہ کے مرکز کی جانب مائل و مرکوز ہو اور اس ماحول میں ہر فرد اس مرکز سے متاثر ہو کر ردِ عمل کرنے کے لیے بے چین ہو۔ فرد کے عمل میں اس تبدیلی کی بنا پر ہی لیبان (LE BON) نے ایک اجتماعی ذہن یا (CROWD MIND) کا تصور کیا اور اس نے دعویٰ کیا کہ ایسے موقع پر افراد کے درمیان انفرادی ذہنی نظام معطل ہو جاتا ہے اور اجتماعی ذہن پیدا ہو جاتا ہے اور اس نظام کے ماتحت ہی افراد عمل کرتے ہیں۔ مگر بعد میں لیبان پر اعتراض ہوا کہ اجتماعی ذہن کی تشکیل علم نفسیات کے لیے ناقابلِ قبول ہے کیونکہ یہ تشریح ضرورت سے زیادہ عنصری پہلو رکھتی تھی۔ انسان کا ذہن عنصری نہیں بلکہ روحانی نظام ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سے انفرادی ذہنوں کے اجتماع سے ایک نئے اجتماعی ذہن کی تشکیل کا تصور کرنا غلط ہے۔ اس سلسلے میں بس اتنا کہنا ہی درست اور کافی ہوگا کہ توجہ اور مقصد کی مرکزیت جمِ غفیر کے روحانی روابط اور تعلقات میں بڑی تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں۔ چند نئے روحانی رشتے پیدا ہو جاتے ہیں جن کی بنا پر جمِ غفیر کے افراد اس سے جدا اور متعلق اعمال ۴۴

کرچکے ہیں، یہ مجمع تو خاتون کربلا کی اعجاز بیانی سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ کسی بھی مہذب، باشعور اور پڑھے لکھے مجمع کی بہ نسبت زیادہ غور و توجہ کے ساتھ معظمہ کے خطبہ کو سُن رہا تھا۔ یہ بھیڑ یا جمِ غفیر رہا ہی نہیں تھا۔ یہ تو کسی اسمبلی یا کونسل سے بھی زیادہ منظم گروہ یا جماعت بن چکا تھا۔ چنانچہ خاتونؑ کربلا نے اسی کے مطابق خطابت بھی کی۔

ابھی تو امام حسینؑ شہید ہی ہوئے تھے مگر ابھی سے خاتونِ کربلا ثانیٔ زہراؑ نے اپنی صلاحیتوں سے اُس عظیم انقلاب کے لیے زمین ہموار

[illegible]

کرنا شروع کردی تھی جس کی وہ خود ذمہ دار تھیں۔ حسینی عناصر کی ہمت افزائی اور یزیدی عناصر کی بیخ کنی کی یہ پہلی کوشش تھی جس میں علیؑ کی بیٹی بڑی حد تک کامیاب ہوئی تھیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ بنت علیؑ کا یہ خطبہ اس عظیم انقلاب کا سنگ بنیاد رکھتا ہے جو مختار کی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ ابن زیاد کی جبروتی حکومت میں یہ پہلی آوازِ حق تھی جو اس زور و شور، قوت و حکمت سے حسینؑ کے موقف کی حمایت کر رہی تھی مسلمانوں کے لیے شرم کے آنسو رونے کا مقام تھا کہ بدقسمتی سے یہ آواز صنفِ نازک کی ایک فرد کی تھی جو عرصۂ دراز سے مصائب کا شکار تھی۔ واقعی وہ اسلام پر بڑا سخت وقت تھا جب بنت علیؑ جیسی محترم بی بی کو اس کی حفاظت کی خاطر پلیٹ فارم پر آنا پڑا تھا۔ حضرت زینبؑ کی نسائیت نے اس وقت وہ کام کیا جو کسی بھی مرد کی شمشیر نہ کرسکتی تھی۔

خطبہ کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معظمہ کے کردار و اخلاق میں وہ تمام صفات حمیدہ موجود تھے جن کا ایک مذہبی راہ نما، بہترین مقررہ اور ہادیٔ زمانہ کے کیریکٹر میں پایا جانا لازمی ہے۔ اس مصیبت کی حالت میں بھی خدا اور رسولؐ کی پیاری خطبہ کا وہ طرز اختیار کرتی ہیں جو اللہ کے رسولؐ کی سنت تھا یعنی خطبہ باقاعدہ حمد و نعت سے شروع ہوتا ہے ورنہ اس قدر مصائب میں گھبرائی ہوئی ایک عورت سے یہ بعید نہ تھا کہ بس براہ راست مقصد کی بات کہنے لگتیں جو کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے قرین قیاس بھی تھا۔ مگر ایسا نہیں۔ معظمہ کے تخاطب میں ایک نظم و ضبط ہے، ایک سنجیدگی اور اپنے موقف کا خیال پیش نظر ہے۔ خطبہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ جناب زینبؑ اس شہر میں شہزادی بن کر رہ چکی تھیں اور آج قیدی بن کر آئی تھیں۔ مگر پھر بھی ان میں اعلیٰ درجہ کا احساس خودی موجود تھا۔ جیسا ہم نے پہلے بھی لکھا۔ جناب خاتونِ کربلا گو کہ قیدی تھیں۔ مگر وہ اپنے خاندانی اور روحانی شرف کا پوری طرح احساس رکھتی تھیں اسی لیے نتیجتاً احساس خودی کو انھوں نے نہیں کھویا تھا۔

۴۴

انجام دینے لگتے ہیں جیسا کہ اُن میں کا کوئی شخص انفرادی طور پر انجام دیتا۔ لیکن اگر اجتماعی ذہن کے نام کی کوئی چیز ہے تو وہ انہیں ذہنی خصوصیات کا نام ہے جو افراد کے عمل میں مقصد کی مرکزیت کی بنا پر پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ ذہن کوئی نئی خارجی تشکیل نہیں ہوتا۔

جم غفیر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے افراد بڑی حد تک اپنے ذاتی ادراک کو کھو بیٹھتے ہیں اور مقصود مرکز کی طرف ہدایت کرنے والے لیڈر یا ہیرو کے اشارات پر عمل کرتے ہیں۔ اس فطرت کو نفسیات (SUGGESTIBLITY) میں ہدایت پذیری کہتے ہیں۔ ذاتی ادراک معطل ہونے کے سبب سے وہ بے انتہا جذباتی ہوجاتے ہیں اور کوئی بھی جچتی ہوئی بات ان سے بہت جلد عمل کرادیتی ہے۔ ان کے عمل میں اس قدر "جذباتی شدت" "سرعت" اور "ادراک کی کمی" ہوتی ہے کہ وہ صرف دوسرے کے کھینچے ہوئے اشاروں پر ہی کام کر بیٹھتے ہیں اور اس میں اکثر اس پر بھی غور نہیں کر پاتے کہ ان کا یہ عمل مقصد کے حصول میں کسی اعتبار سے معین ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں۔

بس ضروری اتنا ہے کہ بظاہر وہ عمل وقتی طور پر مقصد برآری کی طرف اشارہ کرتا ہو خواہ مستقبل میں وہ مقصد کے لیے خطرناک ہی کیوں نہ ہو۔

اب ناظرین پر واضح ہوگیا ہوگا کہ جم غفیر میں کیوں عقلی باتیں کہنا خلاف اصول ہے کیوں جذباتی فقروں کا بار بار دہرانا ضروری ہوتا ہے۔

بجائے اس کے کہ وہ آج قیدی کی حیثیت سے لجاجت میں ڈوب کر اپنے حواس کھو بیٹھتیں۔ انھوں نے حواس سے کام لیتے ہوئے اپنا صحیح تعارف پیش کیا اور ان سنگدلوں کو ان کی بداعمالیوں پر غیرت دلائی۔ خود جناب زینبؑ اور سکینہ بنت الحسینؑ تک نے اکثر موقعوں پر اپنے شرف اور برتری کا اعلان اس مظلومی کے عالم میں بھی کیا اور اپنے دشمنوں میں سے اکثر لوگوں سے اس کا اعتراف بھی کرایا۔ یہ خانوادۂ رسالت کی فردوں ہی کا کردار تھا جن کو دنیا نے کتنا ہی ذلیل کرنا چاہا۔ مگر ان کی رگوں میں سرایت کیا ہوا احساس خودداری کبھی فنا نہ ہوا۔ زندگیاں دے دیں مگر کبھی ذلیل نہ ہوئیں۔ اگر دنیا نے ذلیل کرنا چاہا تو اپنی نسبی اور اخلاقی شرافت و فضیلت کا بار بار اعادہ کرکے ذلیل کرنے والی دنیا سے خود اپنا کلمہ پڑھوایا۔

خطبہ کے الفاظ اعلان کرتے ہیں کہ علیؑ کی بیٹی میں کس قیامت کی جرأت و ہمت تھی اور آپ کو فن خطابت میں کیسی بے نظیر مہارت حاصل تھی۔

کوفہ کے بازار میں یہ خطبہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ دربار میں جانے سے قبل جناب زینبؑ ابن زیاد کو باخبر دینا چاہتی تھیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا ہے اور یہ کہ حسینؑ کی ہمشیر اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کوفہ میں وارد ہوئی ہے۔

فی الحال خاتون کربلا کے اس خطبہ سے دو اثرات فوری طور پر پیدا ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ آپ نے اس مجمع کے کافی افراد کے دلوں کو اپنی ہمدردی کی طرف مائل کر لیا تھا۔ اس مجمع میں خاصی تعداد ان لوگوں کی تھی جو بعد میں ابن زیاد کے دربار میں بھی حاضر ہونے والے تھے۔ ظاہر ہے وہ کوفہ کے بازار ہی میں حضرت زینبؑ کے موقف کی صداقت اور ان کی خاندانی شرافت سن چکے اور اس سے متاثر ہو چکے تھے۔ اس اعتبار سے بنت علیؑ کے لئے دربار ابن زیاد کا معرکہ کسی قدر اپنے حق میں موافق اور سہل ثابت ہو سکتا تھا۔ دوسرا ایک ممکن اثر یہ تھا کہ ابن زیاد کو اس کے مخبروں نے خاتون کربلا کی اعجاز بیانی کی خبر ضرور دی ہوگی اور نتیجتاً وہ اپنی گفتگو میں درشتی اور بہیمیت کسی حد تک کم برتنے کے لئے طے کر چکا ہوگا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہوگا کہ زینبؑ جیسی نڈر اور صاحب کردار خطیبہ سے ذرا سنبھل کر بولنا ہوگا۔ یہ دونوں اثرات جناب زینبؑ بنت علیؑ کے حق میں اچھے تھے۔ اور کیا تعجب علیؑ کی مدبر بیٹی نے ان فوری اثرات کو بھی منجملہ دیگر مصالح کے اپنا خطبہ بیان کرتے وقت پیش نظر رکھا ہو۔

کوفہ کا دربار ظالم حاکم کے بھرے اور سجے ہوئے دربار میں شہنشاہ کونین اور شاہ مشرقین کی بیٹی کو ننگے سر قید کرکے لایا گیا تھا۔ اردو کا کوئی محاورہ اس نازک موقع پر ہمارے اظہار خیال میں معین نہیں ہوتا۔ کیا زینبؑ بنت علیؑ دل پر پتھر رکھ کر ابن زیاد کے دربار میں داخل ہوئیں؟ — نہیں پتھر میں کہاں دم تھا جو ظلم کے اس بے شعور طوفان کو دل پر اثر کرنے سے روک سکے۔ گو کہ محاورہ مستعمل نہیں مگر جی چاہتا ہے کہا جائے حسینؑ کی ماں جائی دل پر ایک ہمالیہ رکھ کر ابن زیاد کے دربار میں گئیں۔ خاتون کربلا کے لئے یہی ایک کار عظیم تھا کہ وہ اس بھرے دربار میں خاموشی کے ساتھ داخل ہو جائیں۔ مگر اس کے بعد آپ نے جو عظیم تر کام انجام دیا وہ صرف علیؑ کی بیٹی کا حصہ ہے۔ کوفہ کے بازار کی تقریر پھر بھی عوام الناس کے مجمع کے درمیان کی گئی تھی۔ وہاں فوج اور پولیس کا اثر ضرور تھا مگر حکومت کا باقاعدہ فوجی نظم و ضبط اس قدر سخت نہ تھا جتنا اس وقت دربار میں تھا۔ مگر تاریخیں گواہ ہیں کہ حضرت زینبؑ نے ان نازک حالات کا مقابلہ اور بھی زیادہ خوبی کے ساتھ کیا۔ وہاں مخاطب ایک عام مجمع سے تھا جو یقیناً سہل تھا۔ مگر یہاں مخاطب حاکم وقت تھا جو زینبؑ بنت علیؑ کے خلاف برپا کئے گئے "فتنہ" کا موجد و موجب اور ذمہ دار تھا۔ وہاں کا عام مجمع از خود خاتون کربلا کا اتنا مخالف نہ تھا بلکہ حکومت کی مادی طاقت نے ان کے دلوں کو ارادی یا غیر ارادی طور پر مسخ کر دیا تھا۔ یہاں اسی ظالم و سخت گیر حاکم سے سامنا تھا جس نے خود اپنی مسخ ذہنیت کو سارے لوگوں پر

مسلط کر رکھا تھا اور جو خود دولت کے نشہ میں اہلِ بیتؑ کا سب سے بڑا دشمن اور بنی امیہ کا سب سے بڑا نمک خوار غلام تھا۔ ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ بنتِ علیؑ نے بازار کوفہ میں عام مجمع کو مخاطب کر کے اپنے دل میں قوت و ہمت کا نیا خزانہ جمع کر لیا تھا۔ اس فاتحانہ تقریر نے ان میں آئندہ اس سے زیادہ شدید اظہارِ خیال کی جرأت پیدا کر دی تھی۔

ایک حاکم اور وہ بھی بے حیا اور ظالم حاکم، اپنی پوری بے حیائی اور ظلم و تشدد کے ساتھ تخت پر بیٹھا تھا۔ اور علیؑ کی بیٹی اپنی پوری شرافت و مظلومیت کے ساتھ مقابل کھڑی تھیں۔ اس صورت حال میں عام عقل تو یہی سوچ سکتی ہے کہ حضرت زینبؑ اپنی شرم و حیا کو قائم رکھتے ہوئے وہاں کھڑی بھی نہ رہ سکی ہوں گی اور بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔ مگر تاریخ اس کے برعکس بتاتی ہے۔ خاتونِ کربلا شرم و حیا کی چادر بھی لپیٹی ہوئی اپنے اعلیٰ مرتبہ کا اظہار نہایت پُر قوت الفاظ میں حاکم کے سامنے کر رہی تھیں۔

ابن زیاد نے اہلِ بیتؑ کو اپنے دربار میں بلوایا ہی اس لئے تھا کہ ان کی مظلومی پر ہنسے اور اپنی فتح پر خوش ہو مگر حضرت زینبؑ بھلا امام حسینؑ کی نائب ہوتے ہوئے اس کو ایسا موقع کب دے سکتی تھیں۔ جو لفظ ابن زیاد اہل بیتؑ کا دل جلانے کے لئے کہتا تھا اس کا سخت تر جواب علیؑ کی بیٹی دے کر اس کے حوصلوں کو پست کر دیتی تھیں۔ خاتونِ کربلا کا حاکم کوفہ سے یہ مکالمہ اس حقیقت کی پہلی مثال ہے کہ یزید اور یزید کے ساتھی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ بنتِ علیؑ کے حوصلوں نے تو شاید ابن زیاد کو یہ بھی محسوس کرا دیا ہوگا کہ اس سے بھی سخت مظالم کر کے اہلِ بیتؑ کو صحیح معنوں میں رسوا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت زینبؑ جب ابن زیاد کے دربار میں پہنچیں تو باپ کی کرسی پر ظالم حاکم کو بیٹھے ہوئے اور اپنے چہیتے بھائی کا کٹا ہوا سر ایک طشت میں حاکم کی کرسی کے نیچے رکھا ہوا دیکھا۔ یہ وقت خاتونِ کربلا کی صلاحیتوں کو ایک چیلنج تھا اور ان کے کیریکٹر کا سخت امتحان تھا۔ اس صورت حال میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے چند صورتیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ ایک غم کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو جاتیں یا جذبات کی رَو میں شکوے و شکایت زبان پر لاتیں یا کم از کم اپنی خودی کو کھو کر حاکم کے سامنے سرنگوں ہو جاتیں اور رحم کی درخواست کرتیں۔ اول دو صورتیں تو ثانی زہراؑ کی شان کے خلاف تھیں کیونکہ وہ صابر بھائی کی صابر بہن تھیں اور انھیں ابھی اور بھی کار ہائے نمایاں انجام دینا تھے۔ اگر ابھی سے وہ بے ہوش ہونے لگتیں تو مستقبل کی ذمہ داریوں کو کون سنبھالتا۔ ان کے اندر یہ جو عام نفسیاتی ردعمل پیدا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ ان کے اندر فطری جذبات پر احساس ذمہ داری حاوی تھا۔ تیسری صورت یعنی حاکم کے آگے سر جھکا دینا تو یہ حضرت زینبؑ کے لیے فطری طور پر ہی ناممکن تھا۔ اگر اب تک کے گزرے ہوئے واقعات ہی کو پیش نظر رکھا جائے اور ان کے کردار کا جائزہ لیا جائے تب بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کا امکان حضرت ثانی زہراؑ کے کردار میں تھا ہی نہیں۔ جن زینبؑ نے شب عاشور اور یوم عاشور امامؑ کے ساتھ مصائب برداشت کر لئے وہ زینبؑ آج کیونکر پیچھے ہٹ سکتی تھیں جب کہ اب بہر حال ان پر اس سلسلے میں ایک بڑی ذمہ داری عائد ہو چکی تھی۔

"تاریخ اعثم کوفی۔ روضۃ الصفا۔ تاریخ کامل۔ تاریخ ابن خلدون" سب ہی تاریخوں نے لکھا ہے کہ ابن زیاد اپنے دربار میں جناب امام حسینؑ کے لب و دندان کو اپنی چھڑی سے جنبش دے رہا تھا۔ جناب زینبؑ نے اپنے فرائض کو ہمیشہ بڑے فہم کے ساتھ انجام دیا تھا۔ اس درد ناک منظر کو دیکھ کر اگر حسینؑ کی ہمشیر نے اپنے فرض کی انجام دہی کی ہوتی تو یقیناً خطیبۂ اعظم کے جذبات میں انگارہ کی سوزش اور ان کے خطاب میں شمشیر کی برش ہوتی۔ وقت کی مصلحت اسی میں تھی کہ حسینؑ کی ہمشیر صبر کر لیں ورنہ اس منظر پر اگر وہ ردِ عمل کے طور پر تقریر فرما دیتیں تو بالضرور تاریخ نیا رخ اختیار کر لیتی اور حسینی مشن کی تکمیل اس شان سے نہ ہو پاتی جو شان خاتونِ کربلا کے

پیش نظر تھی۔ چنانچہ اس موقع پر ایک صحابیٔ رسولؐ نے ہمت کو سنبھال لیا اور اصلاح کا منصب ادا کیا۔ جناب زید بن ارقم نے اٹھ کر حاکم کو ٹوکا کہ "تو کیا کرتا ہے۔ بخدا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے رسولؐ اکرم ان لبوں کے بوسے لیا کرتے تھے۔" ناظرین غور کریں کہ اگر یہ اصلاح کا منصب خاتون کربلا نے ادا کیا ہوتا اور ابن زیاد کی حرکت کے ردعمل میں کچھ بھی کہا ہوتا تو وہ تاریخ کے سینہ میں گہرا اور ناقابل برداشت زخم بن گیا ہوتا۔

جب اس حاکم نے بیمار امام کے دل کو اپنی ہیبت سے اچھی طرح جانچ لیا تو پھر "سوختہ دل زینبؑ" کی طرف مخاطب ہو کر ان کے دل کے زخموں پر نمک پاشی کرنے لگا۔ یہ مکالمہ جو اس دن حاکم و محکوم، ظالم و مظلوم، ناحق و برحق، مرد و عورت اور نجس و پاک افراد کے درمیان ہوا وہ تاریخ اسلام میں آپ اپنا ایک درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ جس حیوانیت کے ساتھ ابن زیاد نے جناب زینبؑ سے گفتگو کی ہے اس سے زیادہ درندگی اب حد امکان میں نہ تھی۔ کیا ظلم تھا جو امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر نہیں کیا گیا تھا۔ اب ان کی یاد دلا کر طنز کرنا اور صنف نازک کے دکھے ہوئے دلوں کو مجروح کرنا یقیناً انسان صفت درندوں سے بھی بعید تھا۔ یعنی اگر درندہ بھی بدقسمتی سے انسانی جامہ میں پیدا کر دیا گیا ہوتا تب بھی وہ صرف جامۂ انسانی کا پاس کرتے ہوئے اس درندگی سے باز رہتا۔ مگر یہ ننگ انسانیت ابن زیاد تھا جس کا کردار قیامت کو بھی مات کر رہا تھا۔ شاید دنیا کی تاریخ ایسا ظلم نہ پیش کر سکے جب کہ بے گناہ عورتوں اور نادان بچوں کو اس قدر سخت جسمانی اور روحانی اذیت پہنچا کر حاکم خوش ہوتا ہو۔ یقیناً اگر حضرت زینبؑ اپنے دل پر ذمہ داریوں کا ہمالیہ رکھ کر ان کو بخوشی برداشت نہ کر سکی ہوتیں اگر وہ حالات کا مقابلہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی ہوتیں تو اسلام مسخ ہو کر رہ جاتا اور معاذ اللہ درندگی اسلام کا جوہر سمجھی جاتی جو اس وقت حاکم و خلیفۂ وقت کی سنت بن چکی تھی۔ خاتون کربلا نے اس موقع پر بھی اپنی ذمہ داری محسوس کی اور واویلا اور اپنی کس مپرسی کا شکوہ کرنے کے بجائے جو بھی حالات تھے ان میں اعلائے کلمۂ حق شروع کیا۔

ابن زیاد نے اپنے دل کا ارمان نکالتے ہوئے پہلا جملہ زبان سے نکالا جو حسینؑ کی سوختہ دل بہن کے دل کو برباد کرنے کے لئے کافی تھا۔ کہتا ہے "خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں ذلیل کیا"۔ یہ جملہ دو باتوں کا اعلان تھا۔ ایک تو یہ کہ جیسے کہ ابن زیاد اور اس کے ہمنوا اپنے مظالم سے آل رسولؐ کو ذلیل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں خدا کی مصلحت بھی شامل حال تھی۔ زینبؑ بنت علیؑ نے اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ فرماتی ہیں "اس خدا کا شکر ہے جس نے جناب محمد مصطفیٰؐ کے باعث ہم کو فضیلت عطا فرمائی اور دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک و پاکیزہ فرمایا۔ بیشک خدا اسے تو رسوا اور ہر فاسق و فاجر کو ذلیل کرتا ہے اور جھوٹا سمجھتا ہے۔ اور ہم ان میں نہیں ہیں بلکہ وہ دوسرے لوگ ہیں۔"

جناب معظمہ نے اپنے جواب میں دونوں باتوں کو واضح کر دیا۔ اول تو یہ کہ ان سختیوں کے باوجود اہلبیتؑ ذلیل نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ اس خاندان کو تو خدا نے ہمیشہ کے لیے نص قرآنی کی بنا پر عزت بخش دی ہے۔ ہاں رسوا وہ ہوتا ہے جو ان پاکیزہ شخصیتوں کو رسوا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یقیناً فسق و فجور کا مرتکب ہوتا ہے۔ معظمہ نے ذلت و عزت کا معیار یہ مقرر فرمایا کہ عزت اس کو ملتی ہے جس کا عمل بلند اور مسلک اونچا ہو۔ ذلت اس کو ملتی ہے جس کا عمل پست اور رویہ برا ہو۔

محققانہ نقطۂ نظر رکھنے والے اہل فکر کے دلوں میں یہ شبہ ہونا بعید از امکان نہ تھا کہ امام حسینؑ کی شکست ان کے ناحق پر ہونے کی دلیل تھی۔ اس بات کی طرف معظمہ اپنے خطبہ میں اشارہ کر چکی تھیں کہ صرف قتل کر ڈالنا اور زندگی سے لوٹ کھسوٹ کر لینا یا وقتی طور

پر حاوی ہو جانا فتح نہیں ہوتی بلکہ حقیقی فتح وہ ہوتی ہے جو انجام میں بالآخر فتح ہو۔ خدا کی خدائی میں یہ ہوا ہی کرتا ہے کہ ظالم کو اس کی حد ظلم دیکھنے کے لیے وقتی طور پر فتح کی شکل میں مہلت دی جاتی ہے۔ یہاں پھر وہی مسئلہ واضح طور پر درپیش تھا۔ چنانچہ ابن زیاد اسی شبہ کو ایک طنزیہ جملہ کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ "دیکھو تمہارے بھائی کے ساتھ خدا نے کیا کیا" گویا مفہوم یہ تھا کہ (معاذ اللہ) خدا نے ان کو ذلیل کیا تھا ورنہ ایسا نہ ہوا ہوتا کہ ان کے بھائی کا سر کٹ کر حاکم کی کرسی کے نیچے رکھا جاتا۔ جناب زینبؑ نے اس کا یہ جواب دیا:۔

"جو کچھ خدا نے ان کے ساتھ کیا میں نے اس میں بہتری کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا اس لئے کہ آل محمدؐ وہ بزرگ اور معزز گروہ ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنا تقرب بخشنے کے لئے درجۂ شہادت عطا فرمایا۔ لہٰذا یہ حضرات اپنے مقصد دلی کی طرف رجوع کرنے میں عجلت فرماتے ہیں۔ لیکن جناب احدیت بہت جلد ہم کو اور تم کو مقام پرسش پر وارد کر دے گا اور جانبین کی حجتیں کو سنے گا۔ پس اے ابن مرجانہ تو ہی غور کر کہ اس دن نجات ابدی کس کے لیے حاصل ہونے والی ہے"

آپ نے واضح فرمایا کہ امام حسینؑ کی موت ایک شہادت ہے جو اعلیٰ مقصد اور الٰہی اصول کی خاطر واقع ہوئی ہے۔ اور یہ کہ انجام بہرحال حسینؑ کے حق میں ہونے والا ہے۔ ان فقروں میں ایک طرف تو اسی عام شبہ کا جواب تھا۔ دوسری طرف یزید، عبیداللہ ابن زیاد اور اس کے ہمنواؤں پر ایک طنز بھی تھا کہ اہل بیت کے ان دشمنوں کا اہل بیتؑ کو ذلیل کہنا اور مسلمان ہوتے ہوئے رسولؐ کی عترت کو رسوا کرنے کی کوشش کرنا در اصل آل رسولؐ کو خدا کی بخشی ہوئی عزت میں تصرف کرنے کی غرض سے تھا۔ دنیا کے پردہ پر دیوانہ ہوس کی یہ مہمل ترین مثال تھی کہ خدا کی کارفرمائی میں تصرف کی خواہش

کی جائے۔ خاتون کربلا نے دشمن کی اسی ہوس کی طرف اپنے جواب میں اشارہ فرمایا ہے۔ واقعی یہ جواب بڑا سخت تھا جس پر ابن زیاد جیسا مادی طاقت رکھنے والا حاکم غصہ میں آگیا[ا] اس کو اس قدر غصہ آیا کہ جناب ثانی زہراؑ کے قتل کا حکم دیدیا اور بعد میں عمرو بن حریث کی مداخلت پر اس ارادہ سے باز رہا کہ زینبؑ ایک عورت تھیں۔ بنت علیؑ کی مدبرانہ صلاحیتوں کو مد نظر رکھ کر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ابن زیاد کی طرف سے اس قسم کے ردعمل کا امکان محسوس کر رہی ہوں گی اور اس کے باوجود شعوری طور پر آپ نے وہ تمتمن جواب دیا کہ حاکم کے دانت کھٹے کر دیئے۔ قربان ہماری جانیں خاتون کربلا کی اس جان نثاری اور ان کے بلند عزائم پر۔

اس کے بعد ابن زیاد ایک جملہ کہتا ہے جو ہمارے خیال میں امام حسینؑ کے برحق ہونے اور مخالفین کے ناحق ہونے پر خود ایک مضبوط دلیل سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ جملہ اس نے کہا تو اس لیے تھا کہ دل شکستہ زینبؑ کے قلب کو دلائل سے نہ سہی واقعات کی یاد دلا کر ہی دکھایا جائے۔ مگر درحقیقت ابن زیاد نے اس جملے میں اپنی تمام کمزوریوں اور نقائص کا اعتراف کر لیا۔ کہتا ہے:۔

"باغی حسینؑ اور اہل بیتؑ کے قتل سے ہمارے قلب کو شفا ہو گئی!" اس میں نہ کوئی دلیل تھی اور نہ موقف کی بلندی کا اعلان تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کا اعتراف خود جناب زینبؑ نے بھی کیا۔ لیکن ابن زیاد خود اپنی زبان سے اپنے ناحق ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ صاف کہہ رہا تھا کہ اس کی جنگ کسی اصول کی خاطر نہیں تھی بلکہ صرف حسینؑ سے ذاتی مخاصمت اور آل رسولؐ سے عناد کے سبب تھی۔ اس نے امام حسینؑ کو اس لئے نہیں قتل کیا تھا تاکہ کسی اصول کی حفاظت ہو سکے

[ا] یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جتنی جس کے پاس طاقت زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی اس کو غصہ کم آتا ہے۔ پس جناب زینبؑ کا جواب واقعی بے انتہا سخت تھا

بلکہ صرف اس لئے کہ اس کے درندہ صفت قلب کو تسکین ہو۔ بنت علیؑ نے اس کا اعتراف کیا اور فرمایا: "اگر اس میں تیرے دل کی شفا ہے تو شفا حاصل کر۔" گویا معظمہ اعلان فرماتی ہیں کہ وہ اور حسینؑ تو گھر سے نکلے ہی اس لئے تھے کہ بنی امیہ کے ذاتی بغض و عناد کا شکار ہوں گے اور خوب ہوں گے۔ اس حد تک کہ اسلام پر سے اموی مظالم کے بادل ہمیشہ کے لئے چھنٹ جائیں۔ حسینؑ اور ان کے گھر والے ہر طرح کی مصیبت برداشت کر سکتے تھے۔ جس سے ان کے دشمن کے دل کو تسکین و مسرت حاصل ہو مگر انھیں حق اور اسلام کے سچے اصولوں کی قربانی کسی قیمت پر برداشت نہ تھی۔ اس مکالمہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علیؑ کی بیٹی میں کیا کیا جوہر موجود تھے جو اس مظلومی کے عالم میں بھی نہ صرف ظالم حاکم کو جواب دے سکیں بلکہ اپنے موقف کی بلندی اور اپنے نسلی امتیاز کو ثابت کرتے ہوئے دشمن کے حوصلوں کو پست کر دیا جس کا اعتراف خود حاکم نے خاتون کربلا کے قتل کا حکم دے کر کیا۔ گویا اب حاکم کے پاس عقلی گفتگو کے لئے کوئی پہلو باقی نہ رہا تھا۔

اس کے بعد ابن زیاد ہمارے بیمار و مظلوم امام حضرت زین العابدینؑ کی طرف متوجہ ہوا انھوں نے بھی اس کو دندان شکن جواب دیئے جو ہم نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے موضوع سے باہر ہیں۔ بیمار امام کے جواب میں بھی شکست خوردہ حاکم نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ حضرت زینبؑ کو اپنے قتل کا تو کوئی خوف تھا ہی نہیں لیکن امام عصرؑ کی زندگی کی ضرور فکر ہوئی اس وقت انھوں نے پھر اپنا ایک فرض محسوس کیا کہ امام وقت کی حفاظت کی جائے جو پھوپھی یوم عاشور بعد عصر بیمار بھتیجے کو جلتے ہوئے خیمہ سے نکال کر لائی تھیں انھیں نے آج اس بھتیجے کی شہادت و موت سے اپنی شہادت و موت وابستہ کر دی اور قتل امام کا یہ شرط لگا دی کہ ان کے ساتھ خود ان کی اگر گردن بھی قطع کر دی جائے۔ خاتون کربلا کے اس عمل میں اس انتہا کی فرض شناسی، محبت، خلوص اور خدمت شعار کے جذبات شامل تھے کہ ابن زیاد جیسے درندہ صفت حاکم پر بھی اس کا اثر ہوا اور وہ امام کے قتل سے صرف اس عظیم شرط کی بنا پر باز رہا جو علیؑ کی بیٹی نے پیش کی تھی۔ کیا علیؑ کی بیٹی کا یہ ایثار ان کو بڑے بڑے شہدائے راہ خدا کی صف میں جگہ نہیں دیتا۔ بلکہ ہم تو دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے کو مقام ذبح پر پیش کر کے ذبیح اللہ کا خطاب پایا ویسے ہی جناب زینبؑ بنت علیؑ نے بھی اپنے کو مقام شہادت میں پیش کر کے اس لقب کا استحقاق حاصل کر لیا۔

کوفہ میں ان مخدرات عصمت و طہارت کو غلاموں اور کنیزوں والے قید خانہ میں رکھا گیا۔ کوفہ کے قیام کے دوران میں اور قافلہ کے بازاروں سے گزرتے وقت کی بھی اکثر روایتیں مشہور ہیں جن کو ہم نے عمداً طول کے اندیشہ سے نظر انداز کر دیا ہے۔ ان روایتوں کو تاریخی طور پر کوئی سند حاصل نہیں ہے۔ ان سے معظمہ کے کردار کی دو خصوصیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اول تو یہ کہ عوام الناس اکثر غلط فہمی میں تھے اور دھوکے میں اہل بیتؑ کو ذلیل سمجھتے تھے جس پر حضرت زینبؑ علیا مقام قلب کو قوی رکھتے ہوئے اپنا تعارف کراتی تھیں۔ حضرت زینبؑ اور ان کے ہمراہیوں نے کسی بھی مقام پر اپنی خودداری کو نہ چھوڑا۔ لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر صدقہ دیا تو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ ہم آل رسولؐ ہیں اور ہم پر صدقہ حرام ہے۔ حالانکہ نفسیات کا تقاضہ یہ تھا کہ بھوکے بچے ان روٹی کے ٹکڑوں کو قبول کر لیتے۔ اہل بیت رسولؐ کی ان خصوصیات کو ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں اور آگے بھی یہ حقیقت منکشف ہوگی۔

باب ششم

کوفہ کے بعد اور دمشق سے قبل

اب تک جو کچھ ہوا تھا یہ تمہید کہی جا سکتی ہے اس تفصیل کی جو اب آنے والی تھی۔ حضرت زینبؑ بھی سمجھتی تھیں کہ اب گورنر کے بجائے بادشاہ سے سابقہ پڑنے والا ہے جو ایک سخت تر منزل ہوگی جب یزید کا جواب ابن زیاد کو وصول ہو گیا تو اس نے اہل بیتِ اطہار کے قافلہ کو دمشق روانہ کیا۔ کوفہ سے دمشق تک کی مسافت ایک ہزار چار سو اڑتالیس میل بتائی جاتی ہے جو تقریباً اڑتالیس دن میں طے کی جا سکی ہوگی۔ ناسخ التواریخ کے حوالہ سے اہل بیتؑ کا قافلہ ۲۰ صفر ۶۱ھ کو کوفہ سے چلایا تھا اور گویا اندازاً ربیع الثانی کی شروع کی تاریخوں میں دمشق پہونچ گیا ہوگا۔ اس راستہ میں منجملہ اُن مصائب کے جو اب تک کوفہ میں ہوتے رہے تھے حضرت زینبؑ اور ان کے ساتھیوں کے اوپر سفر کی مصیبت مزید تھی۔ بے محمل و کجاوہ اونٹوں پر ننھے ننھے بچے اور نازک بیبیاں بندھی ہوئی تھیں جو ظلم و تشدد کی انتہا تھی۔ خاتون کربلا نے ایک ہزار چار سو اڑتالیس میل کا فاصلہ اسی کرب و بے چینی کی حالت میں طے کیا۔

کوفہ سے چلتے وقت ان اشقیا نے ایسا راستہ اختیار کیا جس کی مسافت اگرچہ زیادہ تھی مگر جس میں شیعیانِ علیؑ کی آبادی کم تھی۔ دجلہ والے راستہ میں شیعہ زیادہ تھے۔ یہ بات اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ اب تک باوجود اپنی مادی طاقت کے امام حسینؑ کی روحانی طاقت سے اور ان کی ہمشیر کی اُن بے مثل صلاحیتوں سے مرعوب تھے جن کا اظہار کوفہ میں ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی دانست میں سر کو قطع کر چکے تھے، مگر اس کے ساتھ اس سے ابھی ڈر رہے تھے۔ دراصل یہ بھی امام حسینؑ اور ان کے گھر والوں کے روحانی اثر ہی کا تقاضہ تھا کہ یزید نے اپنی دانست میں دائمی طور سے کامیاب ہو کے تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا (جو درحقیقت اس کی زبردست سیاسی غلطی ثابت ہوئی) اب بھی اسی روحانی اثر کے خوف سے انھوں نے دجلہ والا راستہ ترک کرکے طویل راستہ اختیار کیا۔ مگر امام حسینؑ کی حقانیت چھپائے نہ چھپتی تھی چنانچہ تاریخوں میں ہے کہ اس راستہ میں بھی مختلف منازل پر شہر والے شہر میں داخل نہ ہونے دیتے تھے۔ چند جگہوں پر تو لوگوں نے قاتلانِ امام حسینؑ سے جنگ کرکے سیکڑوں کو موت کے گھاٹ بھی اتارا۔ یزیدی فوج کے سرداروں کی پوری کوششوں کے باوجود امام اور ان کے اہل بیتؑ کا صحیح تعارف ہو ہی جاتا تھا۔

جہاں تک معظمہ کی ذات کا تعلق ہے ان درمیانی منازل سے ان کے کردار پر کوئی مزید روشنی نہیں پڑتی بجز اس کے کہ وہ بھی بخوشی ان منازل سے گزرتی رہیں اور ان کا شعور ارادی طور پر اس عظیم ترین منزل کی تیاری میں مصروف رہا جس کے لیے قدرت نے ان کی ذات کو منتخب فرمایا تھا۔

ان درمیانی منازل میں جو بھی اہل بیتؑ سے متعلق شخص یا وہ غیر متعلق شخص بھی جو یزید کا نمک خوار نہ تھا حقیقت سے آگاہ ہوتا تھا وہ مضطرب ہو جاتا تھا اور حسب حیثیت رد عمل ظاہر کرتا تھا کسی جگہ جماعت کا اضطراب جنگ میں ظاہر ہوا۔ کہیں اہل شہر کی بے چینی اس قافلہ کی شہر میں تشہیر کو روکنے سے عیاں ہوئی کسی مقام پر یہودیوں اور نصرانیوں کے ایمان لے آنے سے انکے قلب کی تڑپ ثابت ہوئی۔ غرضکہ اس خاموش سفر میں بھی حضرت زینبؑ اور ان کے قافلہ والے اعلائے حق کرتے جا رہے تھے۔ یہ منازل بھی امام حسینؑ اور حضرت زینبؑ کے مسلسل جہاد کی کڑیاں کہی جا سکتی ہیں۔ دراصل یہ مستقبل میں یزید کے خلاف پیدا ہونے والے انقلاب کی ابتدائی منزلیں تھیں ——— ذہنیتوں کا وہ بڑا

(انقلاب جو شاہ کربلا اور خاتون کربلا کے مسلسل جہاد کا نتیجہ تھا)

کوفہ سے پانچ اڑتالیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام نصیبین ہے جہاں پر جناب زینبؑ کا ایک مرثیہ نقل کیا جاتا ہے، آپ مرثیہ میں بیان فرماتی ہیں:-

"تم لوگ تمام دنیا میں ہماری تشہیر کرتے اور
ہمیں کھینچے پھر رہے ہو۔ حالانکہ ہمارے جد
پر خدائے جلیل نے وحی اتاری تھی۔

"تم خدائے عرش اور اس کے نبیؐ سے
اس طرح پھر گئے ہو گویا تمہارے پاس کبھی
کوئی رسول نہ آیا۔"

"اے بدترین امت خدائے عرش تمہارا
برا کرے اور تم پر لعنت کرے قیامت کی بھڑکتی
آگ میں تم واویلا کروگے۔"

یہ مرثیہ مظہر ہے کہ معظمہؑ کے حوصلے اب بھی پست نہیں ہوسکے تھے۔ مرثیہ میں بالعموم واویلا ہوتی ہے اور اپنی مصیبت کا بیان مگر یہاں خاتون کربلا اپنے دشمن کی بداعمالی کا تذکرہ کرتی ہیں، اپنے اعلیٰ موقف کا نشر کرتی ہیں اور ان ظالموں کو جلد ہی ظہور پذیر ہونے والے مستقبل کا خیال دلاتی ہیں۔ دراصل حضرت زینبؑ بنت علیؑ پیدا ہی اعلان حق کے لیے ہوئی تھیں۔ ماہرین نفسیات قابل اطمینان طور پر نہیں بتا سکتے کہ صنف نسواں کی اس بے نظیر فرد میں خودی اور بلندیٔ نفس اس حد تک کیونکر موجود تھی۔ ہمارے خیال میں تو یہ اشعار مرثیہ ہیں ہی نہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی تقریر ہے جو حسینؑ کی ہمشیر نے اپنے موقف کے حق میں فرمائی ہے۔

تمام مصائب کے ساتھ جو سخت ترین مصیبت تھی اور جس کا کسی بھی انسانی کردار کے تجزیہ میں بار بار تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ تھی کہ جناب زینبؑ کے سامنے پچاس دن تک برابر عزیز ترین بھائی کا کٹا ہوا سر نیزہ پر بلند رہتا تھا۔ یہ سر اس کا تھا جس کی زینبؑ حد سے زیادہ عزیز بہن تھیں اور جس کے مقصد کی فی الحال علمبردار تھیں۔

درمیانی منازل گزرنے کے بعد وہ شہر آیا جو یزید کا دارالحکومت، امام کے دشمنوں کا گڑھ اور بغض علیؑ کا مرکز تھا۔ خاتون کربلا کے لیے اس شہر میں داخلہ ہی ایک عظیم امتحان تھا نہ کہ پھر وہاں اپنے کام کو انجام دینا۔ ویسے تو کوفہ میں بھی کم و بیش وہی حالات تھے جو دمشق میں تھے۔ مگر ان دونوں منازل میں ایک بنیادی فرق تھا اور وہ یہ کہ کوفہ کے عوام از خود امام حسینؑ کے ہوا خواہ تھے اور جبر و تشدد یا غلط پروپیگنڈہ کر کے مخالف بنائے گئے تھے۔ مگر یہاں دمشق میں مدت دراز سے علیؑ کے مخالف عناصر نشو و نما پا رہے تھے۔ یہ تو علیؑ کی مخالفت کا مرکز تھا۔ ناظرین غور کریں کہ اس فرق کی بنا پر علیؑ کی بیٹی کو کن دشوار مراحل سے گزرنا تھا۔ ان حالات میں امر حق اور خوبی سے حسینؑ کے موقف کا اعلان کرنا اور پھر بالآخر اس مخالفت کے مرکز میں امام حسینؑ کی پہلی صف قائم کر کے اپنے ہوا خواہوں کا کلمہ پڑھوا لینا کتنا بڑا کام تھا اور اس کو انجام دینے والی حسینؑ کی ہمشیر اور کربلا کی فاتح خاتون تھیں جو ان خصوصیات کی مالک تھیں اس کے ذکر کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔

باب ہفتم

دمشق میں خاتونِ کربلا کا ورود

جناب زینبؑ بنت علیؑ نے چاروں خلافتوں کے دور دیکھے تھے۔ باپ کی بیکسی دیکھی تھی۔ معاویہ کی گستاخیوں اور سرکشیوں سے خوب واقف تھیں۔ انھیں یہ خبریں بھی مل چکی تھیں کہ کس طرح تلواروں کی نوک پر امیر معاویہ نے اپنے لائق بیٹے کے لیے لوگوں سے بیعتیں لی ہیں۔ موصوفہ کے لیے یہی بڑا کارنامہ تھا کہ وہ ایسے جبر و تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے پہاڑ سا عزم و ارادہ رکھنے والے اپنے بھائی حسینؑ کی شریک غم اور شریک کار بن گئی تھیں۔ مگر اب ایک سخت تر مرحلہ یہ تھا کہ وہ اسی ظالم اور جابر حاکم کے سامنے بہ نفس نفیس آنے والی تھیں بلکہ کھینچ کر لائی جا رہی تھیں، جس کے ظلم کا شہرہ دنیا بھر میں تھا امام حسینؑ نے اسلامی اصول کے خلاف یزید کے چیلنج کو قبول کیا تھا ان کی ماں جائی خاتون کربلا کو اس سے بھی سخت امتحان درپیش تھا۔ انھیں یزید کی گستاخانہ زبان درازیوں کا رد در رد کلہ بکلہ جواب دینا تھا۔ آپ کو پورا احساس و علم تھا کہ یزید کون ہے، کیسا ہے اور یہ کہ اس بے لگام و بدتمیز حاکم سے اس طرح مقابلہ کرنا ہے جس سے ان کے اپنے خاندانی وقار کو ٹھیس نہ لگے اور ساتھ ہی اس ناہنجار حاکم کو اس کی غلطی پر قائل بھی کر دیا جائے۔ ناظرین کو اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ دمشق میں داخلہ حضرت زینبؑ کے لیے ایک بڑا مرحلہ تھا بہ نسبت کوفہ میں داخلہ کے۔

یزید کی ہیبت کا اندازہ بنت علیؑ کو یزید کے افسروں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو دیکھکر بھی ہوتا ہوگا۔ آپ کربلا سے یہاں تک برابر دیکھتی آ رہی تھیں کہ ہر افسر اپنے حاکم کو خوش کرنے کی غرض سے ان ستم رسیدہ اہل بیت رسولؐ کے قلب کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہونچانے کا کوشاں تھا۔ شہر میں داخل ہوتے وقت خاتون کربلا نے دیکھا کہ ان کی بہن اُمِّ کلثوم کی یہ خواہش رد کر دی گئی کہ قافلہ کو ایسے دروازہ سے داخل کیا جائے جدھر ہجوم کم ہو۔ اب ظالم و مظلوم افراد بانیٔ ظلم کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے اس لیے ظلم کی فراوانیاں دکھانے کا یہی موقع سمجھا جا رہا تھا ظالموں نے حضرت ام کلثومؑ کی یہ خواہش بھی رد کر دی کہ نامحرموں کے ہجوم کو کسی قدر کم کرنے کی غرض سے شہدا کے کٹے ہوئے سروں کو ان سے آگے رکھا جائے۔ اِس وقت خاتون کربلا کو اس آخری اور سخت ترین منزل میں اپنے حوصلوں کو برقرار رکھنا تھا۔ تاریخیں گواہ ہیں کہ موقع کی نزاکت نے صنف نازک کی اس مثالی فرد کے عزائم کو اور زیادہ قوی بنا دیا تھا۔

حضرت زینبؑ کے مجروح دل نے اِس جم غفیر میں اپنی بے پردگی برداشت کی۔ انھوں نے نہ اپنے حواس کھوئے نہ باطل کے آگے سر جھکایا، بلکہ شعوری طور پر اس معرکہ کے لیے تیاری کرتی رہیں جب باطل کے ٹھیکدار کو اپنی حقانیت کے آگے سرنگوں کرانا ہوگا

دمشق کے بازاروں سے قافلے کے گزرتے وقت کے چند واقعات ہم نظرانداز کرتے ہیں کیونکہ جناب بنت علیؑ کے کردار سے ان کا کوئی خاص تعلق بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ انھیں ان مصیبت ناک منازل کو طے کرنا پڑ رہا تھا۔ ہاں ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ بغض علیؑ رکھنے والے اس مجمع میں بھی کچھ نافہم اور بھولے بھالے دوستدارانِ حسینؑ موجود تھے جن کو بیمار امام نے یا کسی دوسرے نے جب حقیقت سے آگاہ کیا تو انھوں نے اپنی حالت پر افسوس کیا اور توبہ کی۔ اس سے جناب زینبؑ کی کچھ ہمت بڑھی ہوگی کہ جس انقلاب کی بنیاد وہ اور حسینؑ رکھ رہے ہیں اس کی تعمیر کے حالات پیدا ہو جانا غیر ممکن نہیں ہیں۔

ان خواتین عصمت وطہارت میں شرم وحیا اور پردہ کا احساس
اب تک قائم تھا۔ اگرچہ انھیں مجبوراً عرصۂ دراز سے بے پردہ رہنا
پڑا تھا۔ ان کی رگوں میں سیدہؑ کا خون گردش کر رہا تھا۔ تاریخوں
میں ہے کہ حضرت زینبؑ اور دوسری بیبیاں اپنے چہروں کو
بالوں سے چھپائے ہوئے تھیں۔ سہل ساعدی صحابئ رسولؐ
نے جب معصوم سکینہ کی خواہش پوچھی تو شب کی تاریکی میں اپنا
جنازہ اُٹھوانے والی معظمہ کی پوتی نے صرف یہ خواہش کی کہ نیزہ
برداروں کو آگے بڑھوا دو تاکہ کٹے ہوئے سروں کو دیکھنے والا ہجوم
کم ہو جائے اور ہم جتنا ممکن ہے نامحرموں کی نظروں سے بچے رہیں
امام حسینؑ کے اہلِ حرم کو دمشق کے بازاروں میں بھی تشہیر کرایا
گیا اور دربارِ یزید میں حاضری کے لیے 'باب الساعات' پر روکا
گیا۔ خاتونِ کربلا نے جب سنا ہوگا کہ انھیں وہاں اس لیے روکا
گیا ہے کہ یزید کا دربار اچھی طرح آراستہ کر لیا جائے اور رسولؐ کی
عترت کو ظالم کے بھرپور شان سے سجے ہوئے دربار میں پیش کیا
جائے، تو آپ نے کس دل سے اپنی حالت کو سنبھالا ہوگا یہ ناقابلِ
تصور سی بات ہے۔ آج شہنشاہ مشرقین اور شاہ کونین کی نواسی
کی تشہیر اور بےکسی پر خوش ہونے کا ایک بدکردار حاکم کے دربار
میں اس قدر اہتمام ہو رہا تھا۔ دوسری طرف بنت علیؑ کے بس
میں کیا تھا، بجز اس کے کہ خاموش رہیں اور اپنے موقف کے نشر کا
موقع تلاش کریں۔ مگر اس کثرتِ ہجوم میں نہ ان کی بات سننے کے لیے
کوئی تیار تھا اور نہ دشمنی کے بحرِ ذخار میں اپنے خلاف بات کا کوئی
اثر ممکن تھا۔ اس لیے خاتونِ کربلا نے اپنی صلاحیتوں کو صبر
کی پناہ گاہ میں محفوظ کرنا شروع کیا تاکہ انھیں ایک عظیم ترین
معرکہ میں بروئے کار لایا جا سکے۔ انھوں نے مناسب سمجھا کہ اپنی
زبان وہیں پر استعمال کریں جہاں مادیت کا نظم و ادارہ اپنی پوری
شان و شوکت کے نشہ میں غرق ان کے سامنے آئے ——
انھیں اپنے سامنے بلائے۔

جب رسولِ اسلام کی نواسی دربار میں لائی گئیں تو انھوں نے
اپنی آنکھوں سے اسلامی اصول کا قتلِ عام دیکھا۔ یقیناً یہی موقع
تھا جبکہ خاتونِ کربلا جرأت و استقلال اور وقار و سنجیدگی کا مجسمہ
بن کر منظرِ عام پر آ گئیں۔ یزید کے دربار میں اس وقت جو ماحول
تھا اس پر تاریخِ اسلام قیامت تک خون کے آنسو روئے اور
باشرم مسلمان تا ابد اپنے دین کی تباہی پر سینہ زنی کریں تب بھی
کم ہے۔ آج پیغمبرِ اسلام کی نواسی جس دربار میں لائی جا رہی تھیں
وہ اس کا دربار تھا جو ممالکِ اسلامی اور بلادِ دیگر اسلامی میں رسول
عربیؐ کا خلیفہ و جانشین کہا جاتا تھا، جس کا ہر فعل مطابقِ سنت
رسولؐ مانا جاتا تھا اور جو دعویدار تھا اس کا کہ وہ خود حق پر ہے
اور اس سے سرِ مو مخالفت کرنے والا ناحق پر ہے، باطل پرست
ہے وغیرہ خواہ وہ امام حسینؑ جیسا پاک و پاکیزہ شخص کیوں نہ ہو۔
پیغمبر کی نواسی کو اپنے جد کی محنتوں کی یہ پامالی اپنی آنکھوں سے
دیکھنا پڑی۔ اس وقت انھیں دیکھنا ہی نہ تھا بلکہ منزلِ عمل میں
ان کے سپرد ایک کام بھی تھا۔ انھیں اس منظر کو اپنے زورِ بیان سے
الٹنا تھا۔ ان کے ذمہ اس وقت یزیدیت کے ڈھول کو کھول کر
اس کا پول ظاہر کرنا اور اسلام و یزیدیت کے فرق کو دودھ اور
پانی کی طرح الگ الگ کرنا تھا۔ انھیں یہ کام اس ماحول میں انجام دینا
تھا جہاں یزید کی [illegible] سے زیادہ اس کی مادی طاقت اس کے
اور اس کے [illegible] کو بدمست کیے ہوئے تھی۔ بنت علیؑ کے
پاس نہ تلوار تھی نہ نیزہ [illegible] یزید کے پاس مادی طاقت تھی [illegible]
تھی، [illegible] اور ظلم و تشدد کے کبھی نہ ختم ہونے والے بے
پناہ خزانے تھے۔ نہ صرف یہ کہ حضرت زینبؑ کے پاس بظاہر
طاقت نہیں تھی بلکہ [illegible] انھیں اپنی بےکسی کا احساس بھی کافی سے
زیادہ حد تک [illegible] تھا۔ مگر بہرحال انھیں اپنے فرائض کو تو انجام
دینا ہی تھا۔ اگر [illegible] کربلا (معاذ اللہ) آج ہمت ہار جائیں تو
گویا [illegible] اور شاہِ کربلا کی سب قربانیاں
خاک میں مل جائیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یزید کے دربار کے اس غیر
اسلامی ماحول کا ہلکا سا خاکہ بھی پیش کر دیا جائے۔ جب حضرت
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اہلِ حرم نام نہاد خلیفۃ المسلمین
کے دربار میں داخل ہوئے تو وہ اپنے [illegible] آراستہ دربار میں
شراب کے پیالے لنڈھا رہا تھا اور شطرنج کے مہرہ [illegible] دل

بھلا رہا تھا۔ چنانچہ اور یورپ نے بڑھ کر اعلیٰ ترین اخلاق کا مظاہرہ کرنے والے رسولؐ کا یہ خود ساختہ جابر و ظالم جانشین آج اس جاہ و جلال کا مظاہرہ کر رہا تھا جو قیصر روم کے تزک و احتشام کو بھی مات کر دے۔ تسبیح و تہلیل میں دن رات مصروف رہنے والے پیغمبر کی خلافت کا یہ دعویدار شراب کے جام پر جام لنڈھا رہا تھا اور اس پر فخر کر رہا تھا۔ شراب و دولت کے نشہ میں پاگل اس سرپھرے حاکم کو حلال و حرام کا قطعاً پاس نہ تھا اس کے نزدیک ہر وہ چیز حلال تھی جسے وہ پسند کرے، خواہ وہ شراب نوشی ہو، خواہ وہ نبیؐ کے نواسے کا قتل ہوا اور خواہ اہلبیت رسولؐ کی اسیری قطع نظر اس کے کہ وہ سر خاتون کربلا کے بھائی کا تھا موصوفہ کے لئے بحیثیت محافظہ دین کے یہ بڑا سخت لمحہ تھا کہ رسول اسلام کے نواسے کا سر خلیفہ کے تخت کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ یہ توہین تو اسلام نے کسی سر کے ساتھ بھی جائز نہیں رکھی تھی۔ نہ کہ نبی کے نواسہ کا فرق مطہر۔ اگر حضرت زینبؑ کے جسم میں لرزہ نہ آگیا ہو تو اصول فطرت پر تعجب ہے۔ اس سے بھی سخت دلدوز منظر اس دربار میں دیکھا گیا اس منظر کو دیکھ کر مسلمان عورتوں نے چاہے کتنے ہی آنسو گرائے ہوں لیکن واقعی انھوں نے تاریخی دیانت حق گوئی کی شان دکھا دی۔ مسلمانوں کے شرابی خود ساختہ خلیفہ کی یہ حرکت اس قدر شرمناک تھی جس پر مسلمان قوم کو آج تک شرمندگی ہونا چاہیئے۔ اس پر ہمیں سخت تعجب ہے کہ اس تاریخی واقعہ کو دیکھ کر حضرت زینبؑ کے قلب کی حرکت کیوں نہ ساکت ہو گئی حسینؑ کی حقیقی بہن ہیں اور رسول عربی کی نواسی نے دیکھا مسلمانوں کا وہ خلیفہ اپنے پیالہ کی بچی ہوئی غلیظ شراب امام حسینؑ کے فرق مطہر پر پھینک دیتا تھا۔ ہمارا یہ قلم اپنے قلم کی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہیں اور حضرت زینبؑ کی کردار نگاری کو اس موقع ... ناظرین کے احساس و تصور پر چھوڑتے ہیں۔

یہ تھا وہ غیر اسلامی نظام جس کے خلاف امام حسینؑ نے بغاوت کی تھی۔ آج حسینیت کو ... [illegible] خود اپنے آپ ... [illegible] ... [illegible]

کے لیے ایک زبردست خطرہ بن گئی تھی اور بنی ہوئی ہے جس کے لیے امام حسینؑ نے جتنی قربانیاں دی ہیں اور وہ خود جتنی تکلیفیں برداشت کر رہی ہیں وہ سب کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ موقع تو اتنا نازک آگیا تھا کہ رسول کے خاندان والے ابھی مزید مظالم برداشت کر سکتے تھے، بشرطیکہ انسانی امکانات میں کوئی ظلم باقی رہ گیا ہوتا۔ ہمارے درود علی کی بیٹی اور حسینؑ کی چہیتی بہن ثانی زہراؑ پر جن سے انھیں سخت مصائب میں مبتلا کر کے بھی ظالم حاکم اپنے ظلم کا اسلامی جواز حاصل نہ کر سکا جن کو سخت مشکلوں میں گرفتار کر کے بھی بحیثیت نبیؐ کی نواسی اور حسینؑ کی جانشین کے شعوری یا غیر شعوری، ارادی یا غیر ارادی کسی بھی طرح یزید اپنی زندگی پر اسلامی مہر تصدیق نہ لگوا سکا۔

اوّل تو اہلبیت نبوی کی طرف مسلمانوں کا یہ خلیفہ متوجہ ہی نہ ہوا اور ان مخدرات عصمت و طہارت کو بالکل کنیزوں کی طرح کھڑا رہنے دیا آخرکار سالار قافلہ جناب عابدؑ نے خود یزید سے فرمایا "ہم کھڑے ہیں اور تو ہماری طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا" یزید کا متوجہ نہ ہونا خاندان رسالت کی توہین تھی، مگر اس کی توجہ حضرت زینبؑ کے لئے اور بھی تکلیف دہ ہوئی۔ یزید جب اپنے سامنے عابد بیمار سے مخاطب ہوا اور امام بیمار اپنے منصب کی ادائیگی میں یزید کو دندان شکن جواب دے رہے تھے۔ خاتون کربلا نے دیکھا کہ شکست خوردہ حاکم نے ابن زیاد کی طرح دلائل کی عدم موجودگی میں پھر اسی بزدلانہ حربہ کا سہارا لیا اور علی ابن الحسینؑ کے قتل کا حکم دے دیا۔ حضرت زینب بنت علی پھر آگے بڑھیں اور یزید کی درندگی کو اس کے بھرے دربار میں ظاہر فرمایا "اے یزید تیرے لیے وہ خون جن کو تو بہا چکا کافی نہیں ہے۔ اگر تو اس بیمار کو بھی قتل کرانا چاہتا ہے تو مجھے پہلے قتل کر دے" یقیناً یزید اپنے ... سے پہلے خود اپنے ضمیر کا قتل کر چکا تھا۔ اور ... حق پرست ... سے آگاہ ... [illegible] ... کو مزید ... ظاہر کرنا ... نے اپنا ... بھائی

جناب ثانیٔ زہرا کا یہ فقرہ بھرے دربار میں حاکمِ وقت کی درندانہ ہوس کا اعلان تھا۔ یہ جملہ نشریہ تھا یزید کی شکست خوردگی کا مقصد میں ناکام رہنے کا، اور حق پرستوں کے قتلِ عام کرانے کا تاریخوں میں ہے کہ جناب زینبؑ کی اس ہمت پر یزید قتلِ امام سے باز رہا۔ یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں قتلِ امام سے باز رہا۔ کیا اس کے دل میں اہلِ بیت کے لیے رحم پیدا ہو گیا تھا؟ ——— لا واللہ ہرگز نہیں، اگر اس کے دل میں آج اتنا رحم پیدا ہو گیا ہوتا کہ وہ اپنے جبر و ظلم میں تبدیلی کر دے تو سیاسی شعور و شاہی ادراک رکھنے والا یزید دوسرے دن ——— بلکہ دوسرے ہی لمحہ اہلبیت سے سخت ترین گستاخیوں کے ساتھ ہرگز پیش نہ آتا۔ یقیناً وہ صرف اس لیے باز رہا تھا کہ زینبؑ بنت علیؑ نے اپنے طنزیہ اور احتجاجی جملہ میں اس کے کمالِ ظلم کو ثابت کر دیا تھا۔ آپ نے واضح فرمایا تھا کہ اگرچہ یزید نے امام حسینؑ کو قتل کر کے اپنے جذبۂ خون آشامی کی تسکین تو کر لی مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس موقع پر ہم قدرت کی مشیت کے سلسلہ میں ایک استفہام پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اب تک کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے جو کام اس وقت عابدِ بیمار نے انجام دیا تھا دراصل جناب زینب بنت علیؑ کا منصب تھا۔ کربلا سے شام تک کے مراحل کی قیادت تو ثانیٔ زہرا کے ہاتھ ہی میں تھی۔ اس وقت منصب میں اس تبدیلی کی کیا مصلحت تھی؟! اس کے دو جواب ہیں۔ یا تو یہ کہ حسینؑ کی ہمشیرہ پر بھائی کی توہین بہت شاق گزر رہی تھی، اور موصوفہ کا قلب اس قدر مجروح ہو گیا تھا کہ قدرت کو ضروری معلوم ہوا کہ میدانِ صبر کی اس مجاہدہ کو مصائب کے انبوہ میں کچھ دیر مہلت دے دی جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سید سجادؑ کی بیماری کی وجہ سے نظریہ امامت گوشۂ گمنامی میں ہو گیا تھا۔ جناب زینبؑ کی قیادت زندگی میں [illegible] قدم قدم کی جگہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو رہی تھی، اور بعد سلسلہ امامت

من جانب اللہ کام انجام دے رہی تھیں لیکن اس وقت موقع ایسا تھا کہ امام کو براہِ راست منصب کے فرض کی انجام دہی کرنا تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں نظریہ امامت سے ٹکر ہوتی تھی چنانچہ حضرت سید سجاد کی منطق نے منصوص من اللہ نظریہ کو مظفر و منصور کر دکھایا۔

خاتونِ کربلا کی ذمہ داریوں کو ایک جملہ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے سپرد یزید کی غیر اسلامی ذہنیت اور اس کی حقیقی ماہیت کو منظرِ عام پر پیش کر کے اسلامی اصولوں کی حفاظت کرنا تھا۔ یہ خدمت، وہ دو طریقوں سے انجام دے رہی تھیں۔ اوّل تو یہ کہ باوجود انتہائی مصائب برداشت کرنے کے بھی وہ یزید کو حق پر مان کر اپنی شکست تسلیم نہیں کر رہی تھیں۔ یہ اندازِ جہاد بالکل ویسا ہی تھا جیسا امام حسینؑ نے اپنی شہادت میں دکھایا تھا۔ یعنی یہ کہ ظلم کو صبر سے شکست دینا اور اپنے موقف کی بلندی ظاہر کرنا۔ اسلام کی خدمت کا دوسرا انداز یہ تھا کہ جناب زینبؑ اہلِ کوفہ، اہلِ شام اور یزید کے دیگر ہوا خواہوں کو خود ان کے دور ان کے غیر اسلامی شعار پر انھیں قائل کر رہی تھیں کہ اسلام [illegible] (اور ساتھ ہی اُن غیر مسلمین پر بھی جو مملکتِ اسلامی میں بلادِ غیر اسلامی کے سفیر تھے)۔ یہ عیاں ہو جائے کہ یزید کا طرزِ زندگی اور مسلک کسی بھی پہلو سے اسلامی نہیں ہے۔ کربلا، اس سے منزلوں و واقعات میں [illegible] حق و باطل کی تو کھینچ ایک تھا [illegible] کے لیے امام حسینؑ اپنا کام انجام دے چکے تھے اور خانوادۂ کربلا برابر مصائب برداشت کر رہی تھیں۔ جیسے کربلا سے کوفہ، کوفہ سے دمشق اور دمشق سے پھر مدینہ کی جو مہم خانوادۂ رسالت نے سر کی، اس میں اس گھرانے کی مقدس ہستیوں نے صرف ایک پیغام دینا چاہا اور صرف اس کی خاطر مصیبتیں برداشت کیں اور وہ یہ کہ یزید حق پر نہیں اور نہ وہ کسی پہلو سے خلیفۂ رسول کہا جا سکتا ہے۔ [illegible] آئے ہیں کہ کس طرح [illegible] مقصد [illegible] امام حسینؑ [illegible] اسلام حقیقی سے یزید کا بعد ظاہر کیا

لیکن اس کام کے لیے یزید کا اپنا دربار خاص طور پر اہم تھا اور خاتونِ کربلا نے یہاں پر بھی اپنے فرض کو بحسن و خوبی انجام دیا ہم کو یہاں پر اس تفصیل سے سروکار نہیں کہ معاویہ نے یزید کے لیے اور یزید نے خود اپنے لیے کس طرح مسلمانوں سے بیعت لی تھی۔ بہرحال اس وقت یزید اپنے دربار میں خلیفۂ رسول کے روپ میں تختِ شاہی پر متمکن تھا اور ہر ملک کے نمائندے بڑے ٹھسکے سے اس کو رسولِ اسلام کا سچا جانشین سمجھ رہے تھے۔ خلیفۃ المسلمین کے دربار میں پیغمبرِ اسلام کے نواسہ اور ان کے اہلبیت کی توہین اس وقت ذاتیات کی سطح سے کچھ اوپر اٹھ کر اصولی حیثیت کی حدود میں پہونچ گئی تھی۔ یہ توہین اسلام کی تھی، خود اصولِ رسالت کی تھی۔ آج یزید اپنی خودستائی میں نہ خدا سے خائف تھا اور نہ عوام کا اس کو کچھ خوف تھا۔ افسوس صد افسوس کہ مسلمانوں سے اس بھرے ہوئے دربارِ اسلام کے اس باغی کے خلاف کوئی بھی صدائے احتجاج بلند نہیں ہو رہی تھی۔ آج اگر یزید کو بر سرِ دربار ٹوکنے کی ہمت رکھنے والی کوئی فرد تھی تو وہ خاندانِ رسالت کی ایک معظمہ ثانیٔ زہرا کی ذات تھی جس کے شیرِ خدا نے اسلام کی حفاظت عمرو بن عبدود کے حملہ کو روک کر کی تھی اسی کی بیٹی نے آج یزید کے بے پناہ ظلم سے ٹکر لی جس ید اللہ نے قلعۂ خیبر کو اپنی قوت سے اکھاڑ کر اسلام کا جھنڈا بلند کیا تھا آج اسی کی لاڈلی نے اپنی قوتِ گویائی سے یزید کے قلعۂ استبداد کو مسمار کرنے کی ٹھانی ——

آج اس دربار میں بڑے بڑے امراء و رؤسا محافظِ اسلام اور اصولِ اسلام کا قتل دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے، مگر قربان ہماری جانیں علی کی بیٹی پر جو اپنی بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں بھی یزید کی درندگی کو عریاں کر کے اسلام و مجرمیت کا فرق نمایاں کر سکیں۔ ذیل میں ہم دربارِ یزید کے چند واقعات کا تذکرہ کریں گے جس سے واضح ہوگا کہ یزید کس حد تک اپنی شراب و اقتدار کے نشہ میں مدہوش تھا اور کس خوبی سے بنتِ علی نے اس کو بے باکانہ ٹھوکریں ماری ہیں۔

خواہ غلط فہمی میں، خواہ جان کر اور خواہ یزید کی "ذہنی عملی" پالیسی کے ماتحت، بہرکیف، ایک شامی نے بر سرِ دربار یزید سے درخواست کی (معاذ اللہ) سامنے کھڑی ہوئی رسن بستہ فاطمہؑ بنت الحسین اس کو کنیزی میں عطا کی جائیں۔ شامی کی یہ درخواست یزید کے اس خواب کی گویا تعبیر تھی جو اس نے قتلِ حسینؑ کی صورت میں دیکھا تھا۔ یعنی وہ یہ سمجھا تھا کہ گویا اس طرح امام حسینؑ کے اہلبیت خوب ہی ذلیل ہوئے۔ مگر فرض شناس نائبِ حسینؑ نے اس نازک موقع پر بھی حسینیت کی پشت پناہی کی اور یزید کو ایک مہلک ضرب لگائی۔ ایک اجنبی نامحرم کی آج اتنی جرأت ہوئی تھی کہ وہ خاندانِ رسالت کی مخدراتِ عصمت و طہارت کو اپنی کنیزی میں مانگے۔ یہ امر بھی یزید کے اسلام نما کفر کا ایک مظہر تھا۔ اگر ایک غیر ذمہ دار شخص کی قبیح خواہش تھی بھی اور خلیفۂ وقت نے اس کو ڈانٹ دیا ہوتا تب بھی صبر تھا۔ نہیں۔ یزید نے بھی اس سلسلہ میں شامی کی خواہش پر اپنی رضامندی ظاہر کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر شامی کا یہ جملہ خود یزید کے منصوبہ کے تحت نہیں تھا تو کم از کم اس کی غیر اسلامی پالیسی کے قطعاً موافق تھا۔ خاتونِ کربلا کے ذمہ دارانہ احساس کو اس بے شعور خواہش سے زبردست صدمہ پہنچا۔ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ معظمہ اس وقت ہمشیرۂ حسینؑ نہیں بلکہ صرف محافظِ اسلام بن گئی تھیں۔ پھوپھی ہو کر نہیں بلکہ حسینؑ کی جانشین بن کر بنتِ علی آگے آئیں اور اس شامی کو ڈانٹ کر فرمایا "تیری یہ خواہش ہرگز پوری نہیں ہو سکتی"۔ ناظرین غور کریں معظمہ کے اس جواب میں غضب کی خودی اور قابلِ تعریف احساسِ برتری موجود ہے۔ کیا کوئی مصیبتوں کی تھپیڑی ہوئی عورت اتنی جرأت کر سکتی تھی جس کو پیٹ بھر کر کھانا اور پانی بھی نہ ملا ہو۔ بہرکیف خاتونِ کربلا کے اس باعزم اور زلزلہ افگن اعلان پر یزید برہم ہوا اور اپنی دولت کے خمار میں بولا "یقیناً اگر میری خواہش ہو تو میں ایسا کرنے پر قادر ہوں" —— خوددار باپ کی خوددار بیٹی نے اور حجتِ خدا کی لاڈلی بہن نے یزید کو منہ توڑ جواب دیا —— "اے یزید: یہ تیرے امکان سے باہر ہے ہاں اگر تو ہمارے دین کو ترک کر کے دوسرا دین اختیار کر لے تو البتہ ممکن ہے"۔ خاتونِ کربلا نے یہ جواب دے کر یزید کے اس

ڈھونگ کی قلعی کھول کر رکھ دی جو اس نے اپنی درندگی پر اسلام کا پردہ ڈال کر رچا رکھا تھا۔ آج بنت علیؑ نے اس کو اس کے اصل بھیانک خدوخال میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور بھرے دربار میں لوگوں کو بتایا کہ اسلام سے یزید کا کوئی تعلق دور کا بھی نہیں ہے۔ انھوں نے گویا واضح کیا کہ یزیدیت نام ہے ظلم و تشدد کے اس نظام کا جہاں ظالم کی ہر خواہش قانون ہے اور جس کا قانون شریعت رسول سے بالکل بے تعلق ہے۔ گویا انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ یزید کی جانب گذشتہ اور آئندہ تمام سلسلے ناحق تھے اور امام حسین کی طرف گذشتہ اور آئندہ تمام سلسلے برحق۔

کوفہ کے دربار میں جناب زینبؑ، سر حسینؑ کے ساتھ بد تہذیبیاں دیکھ چکی تھیں۔ انھوں نے ابن زیاد کے دل خراش جملے سنے تھے اور ان کے جواب بھی دیے تھے۔ کچھ کچھ اسی نوعیت کا ماحول آج یزید کے دربار میں بھی تھا۔ دو درباروں کے ماحول میں یہ اتفاق اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یزید کا اہلبیتؑ کو رسوا کرنے کا بڑا پُر حوصلہ منصوبہ تھا۔ خاتون کربلا نے اس منصوبہ کی بیخ کنی کوفہ میں تو صرف اس حد تک کی تھی کہ ابن زیاد کو گفتگو سے قائل ہی کیا تھا۔ مگر آج دمشق میں موقع کئی معنوں میں زیادہ نازک تھا۔ یہاں انھیں صرف حاکم (یزید) ہی کو خاموش نہیں کرنا تھا بلکہ دربار میں حاضر ملکی و غیر ملکی، مسلم و غیر مسلم عمائد پر خلیفۂ وقت کی شعبدہ بازی بھی ظاہر کرنا تھی۔ اس لیے حضرت زینبؑ نے صرف گفتگو ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال کرتے ہوئے ایک نہایت بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ بنت علی کا یہ خطبہ اگر ایک طرف حق کی بے باک تبلیغ تھی تو دوسری طرف یزید کے کردار کا خاکہ۔ اسمیں حقائق کا ذکر تھا اور یزید کی مکروہ تصویر۔ اس میں امام حسین کے برحق ہونے کے دلائل تھے اور ان کے بے پایاں فضائل۔ "حسین دشمن" ماحول میں یہ خطبہ کیا اہمیت رکھتا تھا اس کے اوپر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے جس ماحول میں علیؑ کی بیٹی نے امام حسینؑ کی قصیدہ خوانی اور یزید کی قدح اس

شان سے کی ہے، یہ وہ ماحول تھا جس میں بڑے رعب و دبدبے والے امرا حضرت رسولؐ کا نام بھی ادب سے لیتے ہوئے ڈرتے ہوں گے، کیونکہ جناب رسالت مآب اُس کے بھتیجے تھے جس کا کلیجہ یزید کی دادی ہندہ نے چبایا تھا۔ یزید کے بے پناہ استبداد اور سخت گیری کا کچھ بھی خیال نہ کرتے ہوئے بنت علی کا یہ اقدام بے انتہا تعریف کا مستحق ہے پس آج حضرت زینبؑ نے پھر وہی منظر دیکھا جو ابن زیاد کے دربار میں دیکھ چکی تھیں۔ خاتون کربلا نے دیکھا کہ یزید اپنی چھڑی سے امام حسینؑ کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ بد تہذیبی کر رہا ہے اور ان کے لب ہائے مبارک کو چھڑی سے حرکت دے رہا ہے۔ بدترین مخلوق اور درندہ صفت شخص کا بہترین مخلوق شخص کے سر مبارک کے ساتھ یہ بہیمانہ شغل کائنات کو ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ یہی نہیں بلکہ یزید فخر یہ اشعار بھی پڑھتا تھا جنکا مفہوم یہ ہے:

—— "کاش آج میرے وہ بزرگ جو بدر واحد میں قتل کئے گئے موجود ہوتے تو بے حد مسرور ہو کر مجھے داد دیتے اور سراہتے کہ میں نے ان کی مصیبتوں کا کیسا انتقام لیا، اور سادات بنی ہاشم کو کیسا قتل کیا۔ یقیناً میں اپنے کو عتبہ کی نسل میں نہ شمار کرتا اگر محمدؐ سے ان تمام باتوں کا جو محمدؐ کر گئے ہیں بدلہ نہ لے لیتا۔ درحقیقت بنی ہاشم نے ملک گیری کے ڈھکوسلے نکالے تھے ورنہ ان کے پاس نہ کوئی فرشتہ آیا اور نہ وحی نازل ہوئی" یہ اشعار، یزید کو یزیدیت کے اصلی خدوخال میں ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج یزید اپنی شاہانہ نادانی میں اپنے تمام سیاسی و سماجی —— اور کسی حد تک دینی بھی —— گذشتہ سلسلوں کو بدنام کر رہا تھا۔ آج تک جو چیز پوشیدہ تھی اس کو یزید خود اپنی سرمستی میں ظاہر کر رہا تھا۔ مذہبی نظریہ سے قطع نظر اگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو بھی یزید کو یہ الفاظ نہیں کہنا چاہیے تھے یہ سب کچھ محمدؐ اور ان کی رسالت کا ہی طفیل تھا جس کے

سبب وہ اس مسند پر بیٹھا تھا کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ یزید خود اس شخصیت کا مضحکہ اڑا رہا تھا جس کا اپنے کو وہ جانشین کہتا تھا۔

یزید کے دربار میں بھی ایک صحابی رسول نے اٹھکر حاکم کو ٹوکا کہ ان دانتوں اور ہونٹوں کے رسولؐ عربی بوسے لیا کرتے تھے یہ ٹوکنا اس وقت کافی نہ تھا کیونکہ جب وہ علی الاعلان خود اس رسول کی توہین میں اشعار پڑھ رہا تھا تو اس کو رسولؐ کے بوسوں کی قدر کرائی جانا بے سود تھی اور پھر اس اعتبار سے بھی یہ کافی نہیں تھا کہ یہ ماشاء اللہ خلیفۃ المسلمین کا دربار تھا صرف ایک گورنر کا نہیں۔ یہاں تو ایک ٹھوس معرکہ کی ضرورت تھی تاکہ معاملہ دودھ کا دودھ اور پانی کی طرح صاف ہو جائے۔ یہ منزل بڑی سخت تھی حضرت زینبؑ کا دل و جگر تھا اور علیؑ کا خون جو اس جگہ پر کام آیا۔ ورنہ اسلام اپنی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ غضب خدا کا، اسلام کے خلیفہ کی آج یہ جسارت ہوئی تھی کہ نواسۂ رسولؐ کی توہین کرے اور خاتم النبیینؐ کی رسالت سے کھلم کھلا انکار۔ ہمیں یقین ہے کہ دربار میں حاضر مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد یزید کی اس جسارت پر چونک پڑی ہوگی اور باوجود اپنی مادی محکومیت کے ان کے قلب سینوں میں کروٹیں لینے لگے ہوں گے۔ مگر وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی مجبور تھے۔ زینبؑ جو حسینؑ کی بہن اور نائب دونوں بیک وقت تھیں باوجود اپنی اسیری کے اس نازک وقت پہ آگے آئیں۔ جن زینبؑ نے اپنے بھائی کا قتل آنکھوں سے دیکھا تھا انھیں آج دن دہاڑے اسلام کا خون ہونا برداشت نہ ہوا اور خطیب اعظم کی لاڈلی بیٹی نے یزید کے دربار میں ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے اپنی سحر بیانی اور حقائق سے پُر اس خطبہ میں یزید کی شقاوت کو جھنجھوڑا اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نیم جان کر دیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ نفسیاتی و منطقی تجزیہ کے ساتھ ساتھ اس بلیغ خطبہ کو لفظ بہ لفظ نقل بھی کرتے چلیں۔ ذیل میں ہم معظمہ کے خطبہ کو نفس مضمون کے اعتبار سے چند ٹکڑوں میں بانٹ کر پیش کر رہے ہیں، تاکہ اسی اعتبار سے اس کا تجزیہ بھی کیا جا سکے۔

پہلا حصہ:-

"حمد خدا کے لیے ہے جو دنیا والوں کا پالنے والا ہے۔ اور خدا کی رحمت ہو میرے جد اور ان کی آل پاک پر حق سبحانہٗ تعالےٰ نے سچ فرمایا ہے کہ انجام کار ان لوگوں کا جنھوں نے بدی پر کمر باندھی ہے اور بے دھڑک بدی کرنے لگے ہیں یہ ہوا کہ انھوں نے بالآخر خدا کی کتابوں کو جھٹلایا اور آیات الٰہی سے تمسخر کیا۔"

دوسرا حصہ:-

"اے یزید جب تو نے آسمان و زمین کو ہمارے لیے تنگ کر دیا اور ہم قیدیوں کی طرح پھرائے گئے تو کیا تو نے سمجھ لیا کہ خدا نے ہم کو ذلیل اور تجھ کو بلند کیا۔ اور یہ جو کچھ ہوا اس لیے کہ تو پیش خدا قدر و منزلت رکھتا ہے جب تو نے دیکھا کہ تیرے لیے اسباب دنیا فراہم اور درست ہو گئے اور ہماری حکومت و سلطنت تیرے لئے خطرات سے صاف ہو گئی تو تو

ملہ یہاں پر ایک صحابی نے مناسب احساس کیا اور اپنا فرض انجام دیا اگر اتنا ہی احساس دوسرے صحابہ زادوں اور تابعین میں ہوتا تو تاریخ اس طرح نہ بنتی اور امام حسینؑ کی شہادت نہ ہوئی ہوتی اور ان کی عنصری زندگی سے دنیا نے فائدہ اٹھایا ہوتا۔

مسرور متکبر اور متمرد ہوگیا۔ ذرا ٹھہر جا جامہ سے باہر نہ ہو۔ اور جلدی نہ کر۔ کیا تو فرمان الٰہی کو بھول گیا کہ یہ خیال نہ کرو کہ کافروں کو ہمارا ڈھیل دینا انکے لیے مناسب ہے ہم نے یہ مہلت انکو صرف اس لیے دی ہے کہ وہ اور زیادہ گناہوں میں مبتلا ہوں اور بالآخر ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب مہیّا اور مقرر ہے۔"

تیسرا حصہ:۔

"اے پسر آزاد کردگاں ! کیا مقتضائے انصاف یہی ہے کہ تیری عورتیں اور کنیزیں پردہ میں ہوں اور دختران رسولؐ بے مقنع و چادر در بہ در پھرائی جائیں ، ہر قریب و بعید، شریف و ذلیل ان کے چہروں کو دیکھے۔ مردوں میں ان کا نہ کوئی سرپرست رہا نہ کوئی حفاظت کرنے والا۔

چوتھا حصہ:۔

" ان لوگوں سے کیا امید ہوسکتی ہے جنھوں نے شرفاء کے کلیجے چبائے اور شہدا کے خون سے جن کا گوشت اُگا . . . . (س) قلیج بے ادبی کے بعد تیرا یہ کہنا کہ اگر بدر (میں) مارے جانے والے میرے بزرگ آج زندہ ہوتے اور میری اس فتح کو دیکھتے تو خوشی کے نعرے بلند کرتے کہ تو نے خوب بدلہ لیا۔ گھبرا نہیں اور جلدی نہ کر عنقریب تو (دنیا) کے گھاٹ اترے گا

اور آرزو کرے گا کہ کاش تو گونگا اور لُنجا ہوتا۔"

پانچواں حصہ:۔

"بارالٰہا تو ہم کو ہمارا حق دلا اور ہم پر ظلم کرنے والے سے ہمارا بدلہ لے۔"

چھٹا حصہ:۔

"اے یزید بخدا تو نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ تو نے خود اپنا ہی پوست چاک چاک اور گوشت پارہ پارہ کیا ذریت رسولؐ کی خونریزی اور ان کی عترت کی بے حرمتی کے گناہ کا بوجھ لے کر تجھے عرصۂ محشر میں پیش رسولؐ حاضر ہونا ہوگا اور خدا ان کا حق دلائے گا ! جو اس کی راہ میں کام آئے ہیں۔ ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس سے رزق پاتے ہیںؐ اس وقت ان لوگوں کو بھی جنھوں نے تیرے اعمال کی تائید کی اور تیرا ساتھ دے کر مسلمانوں پر تجھکو مسلّط کیا معلوم ہوگا کہ ظالمین کو کیسا بُرا بدلہ دیا جاتا ہے۔"

ساتواں حصہ:۔

". . . . اگرچہ حوادث روزگار نے مجھے تجھ سے کلام کرنے پر مجبور کر دیا ہے مگر مجھے پرواہ نہیں ہے تیرے مرتبہ کو حقیر اور تیری ملامت کو گراں سمجھتی ہوں ہماری آنکھیں گریاں اور ہمارے سینے بریاں ہیں۔"

آٹھواں حصہ

" تو جو کر سکتا ہے کر لے ، جو کوشش کر سکے

ہم ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون

جو ہو سکے مگر بخدا تو ہمارے ذکر کو محو نہیں کر سکتا، ہماری شرع کو ضائع نہیں کر سکتا، ہماری درازیِ مُدت کو پا نہیں سکتا اور ان مظالم کا ناپاک دھبّہ اپنے دامن سے دھو نہیں سکتا۔ تیری رائے ناقص، تیری زندگی کے دن قلیل اور تیری جماعت پراگندہ ہونیوالی ہے خدا کی لعنت ہو قوم ظالمین پر[۵۱]"

نواں حصّہ:۔

"محمد اس خدا کے لیے سزاوار ہے جس نے ہمارے اوّل کا خاتمہ رسالت پر کیا اور ہمارے آخر کی انتہا شہادت پر کی۔ ہم خدا سے ان کی مغفرت اور ثواب و مراتب کے زیادہ ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ بیشک وہ بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے۔ وہی ہمارے لیے کافی ہے اور وہی ہمارا اچھا وکیل ہے[۵۲]"

اب ہم خطبہ کے ان نو حصوں کا الگ الگ تجزیہ کریں گے[۵۳]۔

پہلا حصّہ:۔

خطبہ کی ابتدا بالکل اسلامی شعار کے مطابق ہے معظمہ کا انداز تخاطب بالکل وہی ہے جو ایک مومن و مسلم خطیب کا ہوتا ہے بندگی کی شان جو اسلام کی نظر میں مستحسن ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ خطیب پہلے خدا کی حمد کرے اور اپنے عجز کا اعتراف اور اس کے بعد رسول کی رسالت کا اقرار کرے معظمہ کے خطبہ کی ابتدا اس اعتبار سے اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ آپ کی تقریر یزید کے ان اشعار کے فوراً ہی بعد شروع ہوئی تھی جن میں اس نے رسول صلعم کی رسالت سے تمسخر کیا تھا اور خدا کی خدائی کا عملاً یکسر انکار کیا تھا بہ این معنی کہ اس کے الفاظ فرعونیت میں ڈوبے ہوئے تھے بالعموم دنیا کا دستور یہی رہا ہے کہ محکوم اپنے حاکم کی ہاں میں ہاں ملایا کرے یا حد سے حد خاموش رہے۔ مگر محکوم تو محکوم یہاں ایک قیدی ——— اور وہ بھی ستم رسیدہ قیدی ——— اپنی تقریر کی ابتدا ہی ایسے فقروں سے کر رہی تھیں جو از خود یزید کی پالیسی کی سراسر مخالفت میں تھے، اور جن میں اُن حقائق کا نہایت صاف اعلان تھا جن سے حاکم وقت اور نام نہاد خلیفہ ابھی اپنی بےزاری کا اظہار کر چکا تھا۔ مگر وحدانیت اور رسالت کے اصول کی حفاظت کرنے والی خاتون نے اپنا فرض سمجھا کہ اپنا معیاری شعار پیش کر دیا جائے۔ گویا ان ابتدائی فقروں ہی میں حضرت زینبؑ نے یزید کے خلاف اس انقلاب کے اعلان کا پھر اعادہ کر دیا جو امام حسینؑ نے پیدا کیا تھا ——— یعنی یہ کہ خدا ایک ہے وہ ہر تعریف کا مستحق اور قادر مطلق ہے۔ محمد صلعم اس کے سچے رسول ہیں

---

[۵۱] آیت:۔ الا لعنت اللّٰہ علی الظالمین

[۵۲] آیت:۔ انہ وصیم ودو حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل

[۵۳] ان میں سے ہر حصّہ کا تجزیہ آگے کی سطور میں کیا گیا ہے۔ ناظرین کو چاہیئے کہ ہر حصّہ کے نفسیاتی و منطقی تجزیہ سے قبل اصل مضمونِ خطبہ کو بھی پڑھتے چلیں۔

اور اُن کی آل قابلِ صد ستائش ناظر غور کرے اسوقت
منظر کے یہ فقرے بھی دو باتوں کو ظاہر کر رہے ہیں
ایک تو یہ کہ باوجود انتہائی مصائب کے وہ
اب بھی یزید کے فاسقانہ طرزِ حکومت کو صحیح کہنے
کے لئے تیار نہیں ہیں اور اس کے مسلک کی وہ
اب بھی ویسی ہی مخالف ہیں جیسی مدینہ سے چلتے
وقت تھیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی خودداری اب
بھی قائم و باقی ہے، اگرچہ یزید نے اپنی مادی حیلہ
سازیوں سے بہت حد تک ان کی تذلیل کے
سامان مہیا کیے تھے۔ ابتدائی حمد و نعت کے بعد
خاتونِ کربلا قرآن کی آیت "ثم کان عاقبۃ
الذین اساؤا السوأی ان کذبوا بآیات اللہ وکانوا بھا
یستھزءون" بیان فرماتی ہیں۔ ظاہر ہے اس آیت کی
اہمیت اس شخص کے لیے کچھ بھی نہ تھی جو بھی خود
کہہ چکا ہے کہ محمدؐ پر نہ وحی اتری نہ فرشتے آتے تھے۔
اتنا حضرت زینبؑ بھی سمجھتی تھیں، مگر ان کو اسوقت
مسلمانوں کے اس گمراہ اجتماع میں آنے والے
عظیم اصلاحی انقلاب کا بیج بونا تھا۔ پس منظر نے
یہ آیت دراصل ان مسلمانوں کی خاطر پڑھی تھی جو
نادانی میں یا دانستہ طور پر دولت کے نشہ میں
اس وقت حقیقت سے منحرف کر دیے گئے تھے۔
منطقی طور پر غور فرمایئے اس آیت میں بنت علیؑ ایک کلیہ
اور مسلمہ حقیقت بیان فرماتی ہیں۔ ضرورت صرف اسکی
تھی کہ جہالت اور ادراک سے نادانوں کے سامنے قرآن
کے اس فیصلہ کن کلیہ کا اعلان کر دیا جائے حقائق
تو خود اُن کے سامنے پہلے ہی سے یزید اپنے عمل اور
کردار سے پیش کر چکا تھا مجمع میں موجود عقل والوں
کے لئے اب فیصلہ کرنا مشکل نہ تھا کہ یہ دیکھنا کہ
اور دنیا پر انجام کس کا ہوا ہے، خدا کی آیتوں اور
رسالت کو کس نے جھٹلایا ہے اور اس طرح
وہ کون شخص ہے جو نص قرآنی کی بنا پر بدی پر

کمربستہ ثابت ہوتا ہے۔ یزید بھرے دربار میں فخریہ
طور پر رسالت کا مضحکہ اُڑا چکا تھا۔ رسول کی نواسی
نے فوراً موقع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس سلسلہ
میں نہایت نڈر ہو کر قرآن کا اعلان مسلمانوں کے
گوش گذار کر دیا۔ یقیناً وہاں موجود بافہم دشمنوں
نے بھی اس آیت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے
یزید اور اس کے تمام گذشتہ و موجودہ ساتھیوں کو
ناحق اور امام حسینؑ اور حسینی والوں کو برحق تسلیم کر لیا
ہوگا۔ مصائب سے لبریز ماحول میں بھی اس
حیرتناک حاضر دماغی اور حاضر جوابی اور پھر
نص قرآنی سے کلی طور پر دلائل دینا یہ صرف علی کی
بیٹی کا ہی حصہ تھا۔

دوسرا حصہ:۔
جناب زینب بنت علی کے سامنے اس وقت
یزیدیت کا روپ کچھ ویسا ہی ہو کر سامنے آیا تھا
جیسا پیغمبر اسلامؐ کے سامنے عرب کی جہالت کا
یعنی یہ کہ آج یزید بھی اپنی مادیت کے نشہ میں ڈوبا
ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام صلعم نے ساٹھ برس قبل ان ڈوبتے
ہوئے بندگانِ خدا کو انسانیت کی تعلیم دی تھی پیغمبر
کی نواسی آج عیار اور بے ایمان ہونے کے دعویدار
خود پرست یزید کو پیغمبر ہی کے انداز رسالت میں تعلیم
دے رہی تھیں۔ آپ نے قرآن کریم کی وہ آیت
تلاوت فرمائی جو غیر مسلم عرب کفار پر نازل ہوئی
تھی اور آج مسلمان حاکم کے لیے سخت ترین
ضرب کاری۔ رسولؐ کی نواسی نے اس بدمست
کو خدا کا فرمان یاد دلایا کہ گمراہوں کو خدا ہمیشہ
ڈھیل دیتا ہے کیونکہ خدا چاہتا ہے کہ انسانی
رذالتوں کی حدیں دنیا پر پوری طرح ظاہر ہو جائیں
اور تب پھر قدرت اپنی قوت کا مظاہرہ کر سکے
قدرت کا یہ کلیہ آدم سے آخر تک تمام دنیا کے ساتھ

شامل رہا ہے مثلاً فرعون نے جب جناب موسیٰ پر تمام امکان بھر سختیاں وارد کر چکا تب پھر خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے رحمت نازل کی جب نمرود نے اپنی خود ساختہ خدائی کا پورا استعمال کر لیا اور حضرت ابراہیم کو منجنیق پر رکھ کر اچھالدیا گیا تب باران رحمت نے اس آگ کو گلزار بنا دیا۔ گویا قدرت کا منشا ان موقعوں پر صرف یہ ہوتا ہے کہ ظلم کی گستاخی اور صبر کی شان اطاعت دونوں کی حدیں مقرر ہو سکیں اس طرح قدرت اپنے اور انسانی امکانات کے درمیان حد فاصل بھی مقرر فرماتی ہے۔ انھیں مصلحتوں کی بنا پر قدرت کا یہ عام اصول ہے کہ اپنے باغیوں کو سزا دینے یا ان کے منصوبوں کو ناکام کرنے میں جلد بازی نہیں کرتی۔ خاتون کربلا کو قدرت کی اس فطرت پر کامل اعتماد تھا ساتھ ہی ان کو یہ بھی اطمینان اور یقین تھا کہ وہ خود حق پر تھیں اور یزید ناحق پر۔ پس علی کی بیٹی نے بے دھڑک یزید کے انجام کا اعلان فرما دیا اس قسم کے بے باکانہ اعلان کی توقع صرف اس فرد سے ہی کی جا سکتی ہے جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو اور حاکم وقت کے مادی دبدبہ سے قطعاً متاثر نہ ہو۔ جناب زینبؑ کی شخصیت میں یہ دونوں ہی باتیں موجود تھیں معترضہ کے ان فقروں کو پڑھ کر ایک فطری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے یزید کے عبرتناک انجام کے اعلان میں قرآن کی آیت کو ہی بحیثیت دلیل پیش کرنے پر اکتفا کیوں کی۔ کیا وہ اس سلسلہ میں فلسفیانہ اور منطقیانہ دلائل نہ دے سکتی تھیں۔ کیا جناب زینبؑ تاریخ عالم سے اس کی مثالیں پیش نہ کر سکتی تھیں نہیں، ایسا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو وہاں اصول فطرت نہیں مرتب کرنا تھے۔ ان کا مقصد تو صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ دنیا پر ثابت کر دیا جائے کہ یزید مسلمانوں کا متفقہ خلیفہ تو درکنار کسی پہلو سے مسلمان تک نہیں ہے۔ چنانچہ تاریخیں گواہ ہیں کہ ثانی زہرا اپنے دونوں مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئیں۔ انھیں مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بنت علیؑ نے اس مقام پر اور دیگر اکثر مقامات پر بھی نص قرآنی کو دلیل بنایا ہے کیونکہ یزید مسلمان ہونے کا دعویدار تھا اور منطقی اصول کے اعتبار سے قرآن اس کے لیے دلیل کافی ہونا چاہیے تھا

اس مظلومی اور محکومی میں بھی حاکم کو بے باکی کے ساتھ نادم کرنا اور اس کی ذلیل ماہیت کو بر سر عام بے نقاب کرنا اس ماحول میں صرف بنت علیؑ ہی کا کام تھا۔ بنت علیؑ کے یہ جملے وہاں پر موجود مسلمانوں کے لیے تو دلیل کافی تھے ہی مگر اس سے زیادہ اہمیت ان کی یہ تھی کہ دربار میں موجود غیر مسلم ممالک کے نمائندوں کی آنکھوں سے آج معظمہ کے فقرے پردہ اٹھا رہے تھے۔ گویا آپ تمام غیر مسلم معاندین کو بھی مطلع فرما رہی تھیں کہ یزید تو نصیص کی بنا پر مسلمان بھی نہیں ٹھہرتا۔

تیسرا حصہ:

ابھی تک خطبہ میں کلی طور پر یزید کی حیثیت کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ اب جناب زینبؑ جزوی طور پر یزید کی چند مخصوص حرکتوں کا تذکرہ کر کے اس کے کردار کی پستی کو عوام الناس کے سامنے پیش فرماتی ہیں۔ تاکہ آپ کا یہ دعویٰ کہ یزید باطل پرست ہے (جو انھوں نے ابھی کلی طور پر بیان فرمایا ہے) جزوی طور پر بھی ثابت ہو جائے خاتون کربلا اب یزید کی اس ذلیل ترین حرکت کا ذکر فرماتی ہیں جس کا ارتکاب تو درکنار اس کے تذکرہ سے مسلمان کی حمیت کو ایک دھکا لگتا

چاہیئے تھا اور وہ یہ کہ پیغمبر اسلام کی نواسیاں مسلمانوں کے نام نہاد خلیفہ کے دربار میں بے چادر ہوں، جبکہ عوام کی عورتوں کے پردہ کا انتظام کیا جائے۔ علی کی نباض فطرت بیٹی نے موقع کی نزاکت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا اور انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مسلمان ——— مادیت میں خواہ کتنے ہی ملوث کیوں نہ ہوں، بہرحال مسلمان ہیں اور اب ان کی آنکھیں کھولنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ بنت علی کو خوف تھا کہ یزیدیت کا سیلاب سر سے اونچا نہ ہو جائے۔ چنانچہ خاتون کربلا نے یزید کے اس فعل پر نفریں کرتے ہوئے گویا مسلمانوں کے احساسات کو بیداری کا پیغام دیا۔ اس طرح یہ فقرے بھی جناب زینب بنت علی کی اُس مہم کا ایک حصہ ہیں جس کی آپ ذمہ دار بنائی گئی تھیں ——— یعنی یہ کہ یزید کے ہمنواؤں سے اس کی مخالفت کرانا اور امام حسینؑ کے مخالفین سے اُن کا کلمہ پڑھوانا۔ اس وقت وہاں پر حاضر سبھی مسلمانوں اور غیر مسلمین کو بڑی شدت کے ساتھ حکومت کی جانب سے یہ احساس کرایا گیا تھا کہ اہلبیت کی تشہیر یزید کے قلب کو تسکین پہنچا رہی تھی اور وہ اس کو ایک عظیم اور قابل فخر کام سمجھ رہا تھا۔ جناب زینبؑ نے حقیقت واقعہ سے بالکل انکار نہیں کیا۔ جناب زینبؑ نے اسی حقیقت کے ساتھ اپنی طرف سے صحیح قدر (value) کا اضافہ کر دیا۔ آپ نے اسی فعل کو اپنے الفاظ میں ذلیل ترین فعل ثابت کیا۔ یزید نے اہلبیت کی تشہیر کو قابل فخر اور باعث مسرت سمجھا تھا اس لیے کہ معاذ اللہ بقول اس کے یہ ایک خروج کرنے والے باغی کے اہلبیت تھے مگر بنت علی نے اس کو ذلیل ثابت کیا تھا، اس بنا پر کہ پیغمبر اسلام صلعم رحمت عالم کے اہلبیت تھے ——— اس کے اہلبیت تھے جس کی بدولت خود یزید آج مسند خلافت پر بیٹھا تھا۔ معظمہ اس نازک وقت میں یہ باریک منطقی نکتہ سمجھ سکیں اور سمجھا سکیں۔ اس سے ان کی شخصیت میں عقل، دوررسی، نکتہ سنجی اور منطقیانہ صلاحیتوں کے علاوہ بڑی خودداری اور احساس ذمہ داری کی خصوصیات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

چوتھا حصہ:

اصولی حیثیت سے اپنے مخالف کے نقائص بیان کر دینا آسان ہوتا ہے، مگر ذاتی عیوب اور نقائص کا عام اعلان مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ فرد مخالف کی خودداری پر ضرب شدید ثابت ہوتا ہے۔ علیؑ کی بیٹی اس وقت حق کی حمایت کے جذبہ میں چور تھیں اور ان کی کیفیت ایک ایسے بھوکے شیر کی تھی جو ناحق کو ہمیشہ کے لئے ہلاک کر دینے کے درپے ہو۔ معظمہ کی شجاعت و جگرداری پر ہماری جانیں قربان اس بیکسی میں یزید کے ذاتی نقائص کا اعلان کرتی ہیں جو اس نے اپنے بزرگوں سے موروثی طور پر حاصل کئے تھے۔ خاتون کربلا اعلان فرماتی ہیں کہ یزید کا خون ہی ناقص ہے اور اس کے گوشت و پوست میں نسلی شرارت پیوست ہے۔ جناب معظمہ کا یہ اعلان ایک کڑوی حقیقت تھا جو نہ صرف یزید کے ارادوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک ضرب کاری تھا، بلکہ اُن احمق مسلمانوں کے احساس ذمہ داری پر ایک زبردست تازیانہ تھا جنھوں نے مسند خلافت پر یزید کو اپنا خلیفہ منتخب کیا تھا۔

جناب زینبؑ بنت علیؑ کا اس واقعہ کی طرف اشارہ جبکہ ہندہ نے جناب حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا

اس موقع پر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ گویا آپ اشارہ فرما رہی تھیں کہ وہ حرکت بھی ذاتی بغض وعناد کو تسکین دینے کے لیے یزید ہی کی دادی نے کی تھی اور آج یہ حرکت یزید خود بھی صرف اسی لیے کر رہا تھا کہ علی کے خاندان والوں کو تکلیف پہنچا کر اپنے بغض وعناد کے جذبہ کو سکون دے۔ خود یزید اپنے منہ سے یہ اعتراف کر گیا تھا کہ وہ خوش ہوتا اگر اس کے آباؤ اجداد آج اس کو اس فاتحانہ حیثیت میں دیکھتے۔ شاہزادی زہراؑ کو کامل یقین و اطمینان ہے کہ بدر و احد میں یزید کے خاندان والے باطل پرست تھے اور اصول حق کے محافظ علی بن ابی طالبؑ نے انھیں راہ حق کی خاطر موت کے گھاٹ اتارا تھا انھیں یہ بھی یقین تھا کہ یزید کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو بدر و احد کے کافروں کا ہوا۔

پانچواں حصہ:-

یزید کے کرتوتوں اور اس کی نسل کی خصوصیت بیان فرمانے کے بعد اب حضرت زینبؑ اس قادر مطلق کو یاد فرماتی ہیں جس پر انھیں دنیا کی طاقت سے زیادہ بھروسہ تھا، جس پر بھروسہ کر کے آج وہ یزید کو اتنا سخت سست سنا سکی تھیں۔ یہ فقرہ اپنے اندر نکتوں کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ ناظر غور کرے کہ معظمہ کی خودی کس بلندی پر ہے۔ آپ آج اپنی مصیبتوں میں صرف خدا والی کر کے اپنے حق کا جائز مطالبہ کر رہی ہیں۔

یہ ایک کلیہ ہے کہ حق اور فرض کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ کوئی حق اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک اس سے متعلق فرائض انجام نہ پا جائیں۔ جناب زینبؑ آج خدا سے اپنا حق اس لیے مانگ رہی ہیں کیونکہ اول تو انھیں خدا کی رحمت و ربوبیت پر اعتماد تھا اور دوسری طرف انھیں اپنے کردار پر بھی بڑا اعتماد تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی بڑی شان کے ساتھ کر رہی ہیں پس ان کا حق کا مطالبہ جائز و درست ہے۔ ان کی شخصیت کی ایک اور خصوصیت (Trait) ظاہر ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ ان کے افعال بس غیر ارادی طور پر انجام نہیں پا رہے تھے، بلکہ وہ انھیں سوچ سمجھ کر بحیثیت فرائض کے شعوری طور پر انجام دے رہی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ خاتون کربلا کو اپنی شرافت نسل اور کردار کا احساس تھا بلکہ وہ اس کو عوام الناس پر بھی ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ وہ ایک عظیم حق کی مستحق ہیں جس سے انھیں محروم کیا گیا ہے۔ یہ جملہ یزید اور اس کے پرستاروں کے لیے ایک نئی ضرب تھی، کہ دیکھو حق دینے والا اور حقوق کا محافظ تو خدا ہے جو برحق ہے، نہ کہ یزید۔ خاتون کربلا کا یہ جملہ یزید کی خود ساختہ خدائی کو ایک چیلنج تھا، اور اس کی فرعونیت کی بے نقابی کرنے والا۔

چھٹا حصہ:-

ان فقروں میں حضرت زینبؑ اس عام غلط فہمی کو دور کرتی ہیں جو یزید کے پروپیگنڈہ کے تحت عوام کے ذہنوں پر چھا دی گئی تھی اور وہ یہ کہ معاذ اللہ یزید کسی بھی پہلو سے اہلبیت کو ذلیل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ معظمہ پھر نص قرآنی کی بنا پر ثابت کر رہی ہیں کہ یزید اپنے اس ارادہ میں ناکام رہا ہے کیونکہ نبی کے نواسے کو قتل کر کے اور ان کے اہلبیتؑ کو رسوا کر کے اس نے اپنے لیے ایک بڑا عذاب مہیا کر لیا ہے جس کو یزید قابل ستائش کارنامہ سمجھے بیٹھا تھا۔

نص

اسکو بنت علی نصِ قرآنی کی بنا پر قبیح ترین حرکت اور موجب عذاب ثابت کرتی ہیں، پس آپ ثابت کرتی ہیں کہ یزید ذلیل ہوا بہ ایں معنیٰ کہ وہ عذاب کا مستحق ہے اور اہلبیت ذلیل نہیں ہوئے کیونکہ وہ نسلی امتیاز کے حق دار ہیں۔

ساتواں حصہ :-

ہم گذشتہ واقعات کے تجزیہ میں برابر یہ ثابت کرتے چلے آئے ہیں کہ جناب زینبؑ نے باوجود سخت ترین مصائب کے اپنی خودداری کو نہیں کھویا تھا معظمہؑ کے یہ فقرے اس بات کے مظہر ہیں۔ یزید کی شعبدہ بازی اور پروپیگنڈہ کو غلط ثابت کرتے ہوئے معظمہؑ اپنی برتری اور یزید کی پستی کو ظاہر کرتی ہیں۔ بظاہر عام نظروں میں یزید اپنی مادی شان و شوکت کی بنا پر سر زور برتر تھا اور بقول یزید معاذ اللہ حضرت زینبؑ ذلیل ہوئی تھیں مگر معظمہؑ اپنے خطبہ میں یزید کی اس شعبدہ بازی اور پروپیگنڈہ کو بے نقاب فرماتی ہیں کہ ان کی شان تو از خود اس قدر بلند تھی کہ انکا یزید سے ہمکلام ہونا بھی ان کی توہین تھی، کیونکہ جیسا ابھی فرما چکی ہیں، یزید کا گوشت و پوست شہدا کے کلیجے چبانے والی عورتوں کے خون سے بنا ہے۔

آٹھواں حصہ :-

خدائے توانا پر ایمان و اعتماد رکھنے والی علی کی بیٹی نے خطبہ کے اس حصہ میں یزید کی خود ستائی کا کس بے باکی کے ساتھ خاکہ اڑایا ہے ہما پر وظالم حاکم کو زینبؑ ایک ادام چیلنج دے رہی تھیں۔ انھیں یزید کی اسکانی حدیں معلوم تھیں اور قدرت کی عظیم رحمت کا بھی علم تھا۔ اس صورت میں علی کی صابر بیٹی نے ظالم کو اپنی شدید بد ترین

شکل میں آنے کی دعوت دی تھی یقیناً اب یزید کے امکان میں، کوئی مزید سخت تر ظلم باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اگر رہ گیا ہوتا تو وہ اپنے اس حریف کو ایسے سخت الفاظ کو سن لینے کے بعد ضرور استعمال کرتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا یزید نے حضرت زینبؑ بنت علی کے اس چیلنج کا کیوں نہ خیر مقدم کیا اس کے چند ممکن اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ یزید کے امکان میں کوئی ظلم باقی ہی نہ رہ گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ یزید اب مزید ظلم روا رکھنا اپنی پالیسی کے لیے خطرناک سمجھ رہا تھا اور تیسرے یہ کہ وہ خاتون کربلا اور اہلبیت علیہم السلام کے کردار سے بڑا خائف تھا۔ وہ عملاً دیکھ چکا تھا کہ حسین کی ہمشیرہ پر جتنے مصائب زیادہ پڑتے جاتے ہیں اتنے ہی ان کی شخصیت کے جوہر نکھرتے جاتے ہیں اور ان سے مقابلہ اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے بھلا اب یزید کیا امید کر سکتا تھا کہ ایسے صاحبانِ کردار کسی بھی ظلم سے متاثر ہو کر اس کے موقف کو صحیح کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان میں سے تیسری وجہ زیادہ بر محل اور قوی ہے چاہے اب بھی یزید کے امکان میں مزید ظلم باقی رہ گئے ہوں مگر در اصل اب وہ ظلم کرتے کرتے تھک گیا تھا صبر کی ضو فشانیوں نے اس کے ظلم کی تاریکی کو تار تار کر دیا تھا۔

خاتون کربلا کو چونکہ اپنے موقف کے صحیح ہونے پر اعتماد تھا اور اپنے کردار پر فخر، یہ انداز بیاں بھروسے بھی اس سے بخیر مشروط اعلان فرماتی ہیں کہ ان کا ذکر بہر حال دنیا میں قائم و باقی رہے گا جناب زینبؑ عالمِ غیب نہ تھیں۔ پھر آخر وہ اتنا بڑا دعویٰ کیونکر کر سکیں، صرف اس لیے کہ آپ کو یقین تھا ان کا ذکر، ذکرِ خیر ہے اور یہ کہ

ذکر خیر کبھی محو نہیں ہوتا۔ وہ ابھی فرما چکی تھیں کہ یزید جو کچھ مظالم کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا وہ صرف خدا کی طرف سے ڈھیل دی گئی تھی اسی بنیادی ایمان کی بنا پر جناب زینبؑ اس وقت یزید کو چیلنج کر رہی ہیں۔ دنیا کے ارادے قربان خاتون کربلا کے ان حوصلوں پر۔ معظمہ ایک مرتبہ پھر قرآن کی آیت کو دلیل بناتے ہوئے حاکم پر اس کے بھرے دربار میں لعنت بھیجتی ہیں۔ اسکا ظلم ظاہر کر چکنے کے بعد قرآن کے حوالہ سے فرماتی ہیں "لعنت اللہ علی الظالمین"۔

نواں حصہ:۔

معظمہؑ کے اس خطبہ کا اختتام کس قدر پُرسکون انداز پر ہے یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ جب انسان غصہ کے جذبات میں بہنے لگتا ہے تو پھر اس کے الفاظ میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے مگر حضرت زینب کی شخصیت اس عام اصول سے مستثنیٰ ہے۔ آپ کے خطبہ میں تعجب خیز نظم و ضبط موجود ہے۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ آپ کے خطبہ میں یہ نظم کیوں تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی شرافت نسل اپنے برحق موقف، خدا کی رحمت اور اپنے کردار پر پورا اعتبار تھا۔ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد آپ اس خدا کی حمد فرماتی ہیں جس کی طاقت کو وہ لامحدود سمجھتی تھیں اور جس کی رحمت پر انھیں کامل اعتماد تھا۔ حضرت زینب بنت علی کو اُس قادرِ مطلق پر بھروسہ تھا جو غریبوں اور بیکسوں، بادشاہوں اور رعایا، ظالم اور مظلوم سب کا بیک وقت رب ہے۔ ایسے رحیم و کریم خالق کی ربوبیت و وکالت پر خاتون کربلا آج مطمئن تھیں اور ہمارے خیال میں ان کے کردار کی عظمت اور معیار عمل کا راز یہی تھا۔ ہم کہنے کی جسارت کرتے ہیں اگر زینبؑ بنت علی کو خدا کی خدائی پر اتنا بھروسہ تھا تو ضرور بالضرور ان کے خالق کو بھی ایسی مایۂ ناز مخلوق پر فخر و اعتماد رہا ہوگا۔ تب ہی تو ایسی بڑی ذمہ داریاں امام نے اپنی بہن کو سونپی تھیں۔

یہ خطبہ بحیثیت مجموعی جناب زینبؑ کی شخصیت کی ایک خصوصیت یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا ذہن اب تک معطل نہیں ہوا تھا۔ یہ خصوصیت ان کے شعور کی نفسیاتی پختگی کو ظاہر کرتی ہے۔ مقتل ابو مخنف میں ملک روم کے ایک سفیر کا یزید کے اعمال پر تبصرہ اور نفرین مرقوم ہے۔ واقعات سے ہم صحیح طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ روم کا سفیر جناب زینب کے اس خطبہ کے بعد یزید کے خلاف بولنے کھڑا ہوا یا اس سے قبل۔ مگر عقل کا تقاضا یہ کہتا ہے کہ خاتونِ کربلا کے بلیغ خطبہ نے اس کو ایک فطری استفسار کے لیے مضطرب کیا ہوگا۔ بہر کیف روم کے اس سفیر نے ان عجیب و غریب حالات میں یزید کے فعل کو برسر دربار قابل لعنت قرار دیا جو یزید کی خودداری پر زبردست حملہ تھا۔ تاریخوں میں ہے کہ روم کا وہ بے گناہ سفیر حق کی تائید کے جرم میں قتل کرادیا گیا۔ جس حد تک یہ صحیح ہے کہ وہ سفیر جناب زینبؑ کے خطبہ سے متاثر ہو کر یزید کے خلاف برانگیختہ ہوا تھا اور یزید اس سفیر پر اس قدر برہم ہو سکتا تھا کہ اسکے قتل کا حکم دے دے تب یقیناً اس کو حضرت زینبؑ کے اوپر اس سے بھی زیادہ برہم ہونا چاہیئے تھا۔ مگر عملاً وہ معظمہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اور اگر سفیر روم کا یہ سانحہ حضرت خاتون کربلاؑ کے خطبہ کے قبل ہوا تھا تب بھی کم از کم اتنا تو صحیح ہے ہی کہ اسی موقعہ پر اور اسی دربار میں یہ سانحہ ہوا تھا جہاں فوراً ہی جناب زینب نے سفیر روم سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں یزید پر نفریں کی۔ مگر یزید حضرت زینبؑ بنت علیؑ کے معاملہ میں خاموش رہ گیا۔ یقیناً اب وہ امام حسینؑ اور ان کے اہلبیت کے لائے ہوئے انقلاب سے خوف زدہ ہو چکا تھا اور اب علانیہ کھل کر ظلم کرتے ہوئے، پس و پیش کرتا تھا، تب ہی تو یہ ہوا کہ بے چارہ سفیر روم تو اعلاء حق میں قتل کرا دیا گیا، مگر حضرت زینب پر مزید ظلم کے لیے یزید کی قوت ارادی مفلوج ہو گئی۔

سفیر روم نے تعجب کیا تھا یزید کے اس فعل پر کہ اس نے اپنے رسول کے حقیقی نواسے پر یہ ظلم روا رکھا تھا۔ اگر حضرت زینبؑ نے یزیدیت اور اسلام کا فرق دربار یزید میں ظاہر نہ کر دیا ہوتا تو یقیناً اس قسم کے اعتراضات اسلام پر قیامت تک ہوا کرتے، جو آج یزیدیت پر ہو رہے ہیں حضرت زینبؑ بنت علی کے اس احسان کو سچے مسلمان قیامت تک نظر انداز نہیں کر سکتے۔

سفیر روم کی طرح راس الجالوت کو بھی یزید نے قتل صرف اسی بنا پر کرا دیا کہ اس نے یزید کی باطل پرستی پر اسکو ٹوکا تھا تا کہ [illegible]

اب اپنے کردار اور اپنی محنتوں پر بہت کافی اطمینان ہوا ہوگا یہ چھوٹے چھوٹے واقعات حضرت زینبؑ کو ڈھارس دے رہے ہونگے کہ ان کی کوششیں رائیگاں نہیں جا رہی ہیں بلکہ ان سے ٹھوس اور خاموش تبلیغ ہو رہی ہے اب موصوفہ کو یقین ہو چلا ہوگا کہ دمشق کے دربار میں یہ مکمل خاموشی آنے والے اس عظیم طوفانی انقلاب کا پیش خیمہ اور تمہید ہے جس انقلاب کی وہ ذمہ دار بنائی گئی تھیں۔

یزید کے دربار کا معرکہ جب ختم ہوا تو خاتون کربلا کو اس قافلہ کے ساتھ ایک شکستہ زندان میں قید کر دیا گیا تھا۔ دشمن خدا و رسول ظالم حاکم نے اہلبیت رسول صلعم کو ایسے قید خانہ میں قید کیا تھا جس میں بالعموم کنیزیں اور غلام قید کیے جاتے تھے۔ وہ قید خانہ جس میں دن میں دھوپ اور رات میں اوس سے سابقہ ہوتا تھا۔ اس قید خانہ کا تصور عابد بیمارؑ کو زندگی بھر تڑپاتا رہا اور آپ اسے یاد کر کے آہ سرد بھرتے رہے۔ کون جانے کہ حسینؑ کی ہمشیر نے کس طرح اس زندان میں دن گذارے روایتیں ہیں کہ جناب زینبؑ کے اوپر زندان شام کا ماحول سخت ترین ثابت ہوا تھا جس زمانہ میں آپ کا قیام اس محبس میں تھا اس دوران آپ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، اور آپ جب مدینہ پہنچی ہیں تو آپ کے شوہر جناب عبداللہ آپ کو پہچان بھی نہ سکے تھے[لہ]

لہ دیکھو بحار الانوار ، ناسخ التواریخ و منتخب ۔

باب ہشتم

فتح زینبؑ اور شکست یزید

—— غالباً ایک سال تک یہ بےکس و لاچار اہلبیت مقید رہے۔ یزید کی طرف سے برابر کوشش ہوتی رہی کہ ان کی خودی کو ختم کیا جائے اور کسی طرح یزیدیت پر محافظانِ اسلام کی مہر تصدیق لگا لی جائے۔ یزید بہرصورت اپنے تمام منصوبوں میں ناکام رہا اور آخرکار اس نے ایک دن اپنی پسپائی کا اعلان کر ہی دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اہلبیتؑ کو رہا کر دیا جائے اور عزت کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ یزید نے ایک خواب دیکھا جس میں پیغمبر اسلام اسکو نفرین کر رہے تھے۔ چنانچہ اس کو تلقین ہوئی اور صبح کو اس نے رہائی کا فیصلہ کر لیا۔ "نو سو چوہے کھا کر بلی چلی حج کرنے" والی مثل یزید پر بالکل صادق آتی ہے۔ اس کے ہمنواؤں کے بقول یزید کے نفس کا تزکیہ رسول نے خواب میں تشریف لا کر کیا تھا۔ مگر ہمارا دعویٰ اسکے برخلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نہ یزید نے کوئی اس قسم کا خواب دیکھا، نہ اس کو کسی قسم کی تلقین ہوئی اور نہ اس کے قلب کا تزکیہ ہی ہو سکا تھا۔ اس خواب کی شہرت دراصل اموی سیاست کا مدبرانہ حیلہ تھا جو شکست خوردہ یزید نے اس وقت اپنایا تھا۔ حضرت زینبؑ پر وہ امام حسینؑ سے بھی زیادہ مصائب کے پہاڑ ڈھا چکا تھا، مگر [illegible] کے ارادوں میں اس نے سرمو فرق نہ پایا تھا۔ اس کے حوصلے پست ہوگئے اور اس نے اپنی سیاسی شکست کی [illegible] مٹانے کی غرض سے ایک خواب کو مشہور کیا۔ یزید ایسا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا اس کی چند نفسیاتی وجہیں ہم دے سکتے ہیں۔

خواب کے چند ممکن وجوہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر انسان خواب میں وہ بات دیکھتا ہے جس کی اس کو شعوری یا غیر شعوری طور پر شدید خواہش ہوتی ہے اور سماج اس خواہش کو پورا کرنے میں خارج ہوتا ہے یا پھر جب انسان کسی چیز سے خائف ہوتا ہے تب بھی اس خطرہ کو وہ خواب میں دیکھتا ہے۔ ہم یہاں پر اس اصول کی مزید تفصیل سے بحث نہیں کریں گے کہ یہ کس حد تک صحیح ہے اور اس قسم کے خطروں کے خواب کی ماہیت اور روپ کیا ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ شکلیں خوابوں کی ہو سکتی ہیں۔ یقیناً پہلی وجہ یزید کے اس خواب میں شامل حال نہ تھی کیونکہ ظاہر ہے یزید کسی صورت بھی اہلبیت رسول کی رہائی کے لیے بےچین اور خواہشمند نہیں تسلیم کیا جا سکتا اور پھر اگر وہ خواہشمند ہوتا بھی تو وہ بآسانی اپنی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ خواب میں اس امر کی تلقین کے لیے پیغمبر اسلام کو دیکھنے کی اس کے لاشعور کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ جہاں تک دوسری وجہ کا تعلق ہے یزید نے خواب میں [illegible] کو کوئی [illegible] نہیں سوچنے کی بات ہے جس رات یزید کا خواب بیان کیا جاتا ہے اس رات اس کا نفس اہلبیت کی دشمنی پر بدستور آمادہ تھا ——— اور اس کا شعور و لاشعور اہلبیت کو ذلیل کرنے کے آخری منصوبوں کی تدبیر میں مصروف تھا۔ ایسے نفس کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ وہ غیر شعوری طور پر اس قدر [illegible] اسلامی [illegible] مطابق اس پر [illegible] ناول

[illegible] حکیم فرائڈ (S. Freud) کے جدید نفسیاتی اسکول [illegible] [illegible] [illegible]

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ہو سکتا تھا، ایک غلطی ہو گی ہاں اگر وہ رسول عربی کا شیدائی ہوتا ان سے عقیدت رکھتا ہوتا اور اتفاقیہ ان کے اہلبیتؑ کے ساتھ کوئی گستاخی کر گیا ہوتا تب اس سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ اس کا لاشعور قانون شریعت سے خائف ہوتا اور قانون شریعت کی علامت بن کر پیغمبرؐ اسلام اس کو خواب میں نظر آ سکتے تھے اور اس کے شعور کو اس کی غلطی پر نادم کر سکتے تھے۔ مگر ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ یزید کسی پہلو سے بھی اسلام سے ذرا سی بھی عقیدت رکھتا تھا جبکہ ہم اس کے کردار کے عناصر کو اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ جو یزید شعوری طور پر یہ کہہ سکے کہ (معاذاللہ) نہ محمدؐ پر وحی اتری نہ فرشتے آتے تھے اور آنحضرت صلعم کو ڈھکوسلے باز ٹھہرا چکے کیا وہی یزید ان محمدؐ کی تلقین خواب میں لاشعور کے ذریعہ پا سکتا تھا۔ ہرگز نہیں وہ جتنا زینبؑ و حسینؑ کا دشمن تھا، اس سے زیادہ حضرت محمد مصطفےٰ اور علی مرتضےٰ کا تھا، اور شعوری یا غیر شعوری کسی بھی طرح وہ ان حضرات سے عقیدت نہیں رکھتا تھا۔

ایک وجہ خواب کی یہ بھی ہوتی ہے کہ خواب میں بطور پیشینگوئی وہی بات نظر آتی ہے جو حقیقتاً زندگی میں پیش آنے والی ہوتی ہے یزید کے خواب کی یہ وجہ ماننے میں بھی ہم کو تامل ہے کیونکہ اس کو جب رسول کی رسالت ہی پر ایمان نہ تھا تب ان کو اس کا لاشعور بحیثیت پیشینگوئی کرنے والے کے کیونکر دیکھ سکتا تھا اور وہ یہ خواب کیونکر دیکھ سکتا تھا کہ پیغمبر اسلام اس کے اس اقدام پر نفریں کر رہے ہیں کہ اس نے ان کی عترت کو قید و بے پردہ کیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ اس خواب کی یہ تلقین ایک پیشینگوئی کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔

ہم صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یزید نے اہلبیت کو رہا کرنے کا فیصلہ کسی قسم کی تلقین اور تزکیہ نفس کی بدولت نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ارادوں میں مکمل ناکامی اور پسپائی دیکھ کر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب حضرت زینبؑ ایک بے کس قیدی کی بجائے تسلیم شدہ معزز خاتون بن گئی تھیں۔ اب وہ خروج کرنے والے کی بہن نہ تھیں بلکہ باطل کے خلاف جہاد کرنے والے حسینؑ بن علی کی بہن تھیں۔

چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا آسان ہے مگر باوجود انتہائی قوت کے اپنی شکست خود اپنی زندگی میں دیکھنا مشکل ہے ہمیں فخر ہے ——— اور یقیناً حضرت زینبؑ کے خالق کو بھی فخر ہوگا — کہ جناب زینبؑ بنت علیؑ نے یزید ابن معاویہ کو اس مشکل ترین صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ یزید کی شرمندگی اور جھینپ تاریخ اسلام کی ناقابل انکار حقیقت بنکر رہ گئی۔ یزید کا یہ فیصلہ خاتون کربلا کے عزائم کا بے مثل قصیدہ تھا۔ اس کا یہ جدید رویہ بنت علی کی فتح کا ڈنکا تھا یزید کا یہ فیصلہ دمشق کی گلی گلی میں اعلان کر رہا تھا کہ حسینؑ جیت گئے کربلا والوں کا خون کام آ گیا، سکینہؑ کے زخمی کان اور علی اصغرؑ کا زخمی گلا سب کچھ رنگ لا کے رہا۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کہ یزید نے یہ فیصلہ نادم ہو کر کیا تھا، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ جھینپ کر کیا تھا۔ لا واللہ یہ تزکیہ نفس کی شرمندگی نہ تھی، بلکہ اپنی ناکامی پر تاسف تھا۔ کوئی نفس جب اس حد تک غلیظ ہو چکتا ہے جتنا یزید کا نفس تھا تب اس کا تزکیہ وعظ و پند سے بھی ممکن نہیں ہوتا نہ کہ پھر اس طرح ڈرامائی طریقہ پر جیسا یزید کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے۔ اس طرح تو قطعاً ناممکن تھا۔ یہ ندامت یزید کی سیاسی ندامت تھی اور اپنی شکست کا اعتراف تھا۔ اور پھر یہ بھی تعجب اور لطف کی بات ہے کہ بقول شخصے اس کو ہدایت تب ہوئی جب اس کے ترکش کے تمام تیر ختم ہو گئے۔ کون سا ظلم تھا جو اسے جائز نہ رکھا تھا۔ حد سے حد

۲ خواب کی اس وجہ سے پر ہم نے غور اس لیے کیا ہے کیونکہ یہ بھی بہرکیف ایک ممکن توجیہ ہے۔ ورنہ خواب کی اس تشریح اور توجیہ سے جدید علم نفسیات بالکل متفق نہیں ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ ERDMAN لکھتا ہے۔

"A dream has never told me what I ought to think of a person, but to my great surprise a dream has more than once taught me what I did really think of him" [taken from Interpretation of Dreams by S. Freud.]

اب وہ یہی کر سکتا تھا کہ ہر عورت اور بچے کو بھی قتل کرا دیتا۔ مگر وہ بڑا دانی کی حرکت کرتے ہوئے اب ڈرتا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ حسینؑ اور ان کے اکثر رفقا کے قتل نے بھی ان کے بعد زندہ رہنے والے اہلبیت کے رویے میں ذرہ برابر فرق پیدا نہیں ہونے دیا تھا اگر باقی لوگوں کو بھی قتل کرا دیا تو بجز اس کے کہ اس کی سیاست اور زیادہ رسوا ہو جائے کچھ نہ ہوگا۔ اپنے مقصد میں وہ تب بھی ناکام رہے گا اس لیے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ اسی وقت خاموشی سے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا جائے۔ یزید نے جناب زینب کی شخصیت کی بلندی کو اور ان کی بے پناہ صلاحیتوں کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا ورنہ اب تک وہ اپنے باپ کی وصیت پر اندھا دھند عمل پیرا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے کہ حسینؑ اور زینبؑ کی کیا صلاحیتیں ہیں بے طرح ان پر ظلم کئے چلا جا رہا تھا۔ آج یزید کو بس اپنی اس سیاسی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اسی پر متاسف تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ آج اس کے دل میں آل رسول کی محبت کسی معنی میں پیدا ہو گئی تھی اور معاذ اللہ اس کے نفس میں کسی قسم کی پاکیزگی آ گئی تھی

یزید نے ایک اور سیاسی تدبیر کی اس نے چاہا کہ چپکے سے احترام کے ساتھ اہلبیتؑ کو رہا کر کے مدینہ بھیج دیا جائے۔ مگر خاتون کربلا کو اصلی کام تو ابھی کرنا باقی تھا۔ علیؑ کی مدبر بیٹی نے یزید کی اس چال کو سمجھ لیا اور اس کے سیاسی شعور کو ایک مرتبہ پھر زد پہنچائی۔ آپ نے فرمایا کہ مدینہ کے لیے رخصت ہونے سے پہلے وہ دمشق میں ہی اپنے بھائی کی صف بچھانا چاہتی ہیں۔ دنیا کی سیاستیں قربان ہو جائیں جناب زینبؑ کی اس پہلو رس تدبیر پر جو آج اعلاء حق کی خاطر اپنائی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت یزید بقول خود اہلبیتؑ کا ہمدرد بن چکا تھا اور جناب زینبؑ کی کوئی بھی خواہش رد نہیں کر سکتا تھا۔

وہ مجبور ہوا کہ اپنے دار الحکومت میں سرکاری انتظام سے امام حسینؑ کی مجلس عزا برپا ہونے دے۔ حالات دیکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خاتون کربلا نے مجلس کی خواہش صرف جذباتی بنا پر نہیں کی تھی بلکہ اس میں بہت بڑا سیاسی راز چھپا تھا۔ اگر آج بنت علی بغیر مجلس کیے مدینہ چلی جاتیں تو یزید کی تصدیق فراست

یہ بعید نہ تھا کہ وہ پھر اپنی شکست پر کسی طرح پردہ ڈال دیتا۔ اسلئے حضرت زینبؑ نے مناسب سمجھا کہ اس صف ماتم کے بہانے تمام دمشق میں پہلے اپنی فتح کا اعلان کر لیں تب دمشق کو چھوڑیں۔ یزید چونکہ مفتوح ہو چکا تھا اس لیے اس کو فاتح مجاہد یعنی زینبؑ بنت علی کی یہ خواہش بھی پوری کرنا پڑی۔ چنانچہ اسی دن اعلان عام ہو گیا کہ وہ عورتیں فاتح کربلا کا پرسا خاتون کربلا کو دیں جو کل تک ان کی بے کسی پر ہنسا کرتی تھیں آج اسی مجاہدہ کے دست صبر پر بیعت کریں جن کا کل تک مضحکہ اڑاتی تھیں۔ اللہ اکبر! کتنا بڑا انقلاب تھا ——— ذہنیتوں کا انقلاب جبلتوں کا انقلاب، ارادوں میں انقلاب ——— یقیناً دنیا کا انوکھا انقلاب تھا جس میں نہ تلواریں استعمال کی گئی تھیں نہ معرکوں کی خونریزیاں ہوئی تھیں۔ صبر کے اسلحے تھے اور خودداری کی زرہیں تھیں۔ آج زینبؑ بنت علیؑ نے اس دمشق میں امام حسین کا پرسہ لیا تھا اور آل علی کے لیے ہمدردیاں حاصل کی تھیں جو پیغمبرؐ کے زمانہ سے آج تک بغض علیؑ کا مرکز تھا۔ جہاں علیؑ اور اولاد علیؑ کا نام عزت سے لینا سب سے بڑا جرم مانا جاتا تھا۔ حضرت علیؑ کو اس مرکز کو پراگندہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا، لیکن آج ان کی صاحبزادی نے اس عظیم کام کو انجام دے لیا تھا۔

حضرت زینبؑ بنت علیؑ کا یہ ذمہ دارانہ رول دنیا کی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔ یہ مظلومیت کا ہی کردار تھا جس کی بدولت ظالم کے گھر میں مظلوم کا ماتم ہوا بظاہر مادی فتح حاصل کرنے والے کے دار الحکومت میں مفتوح کا کلمہ پڑھا گیا۔ خاتون کربلا اپنے اس رول کی بنا پر نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی محسن ثابت ہوئیں بلکہ عالم انسانیت کے اوپر بھی انکا یہ احسان عظیم قیامت تک بھلایا نہ جا سکے گا۔ کیونکہ انھوں نے انسانیت سوز عناصر کے خلاف ایک انقلاب پیدا کیا تھا شرعی روپ میں تو اسلام کو یزیدیت سے خطرہ تھا ہی۔ اس کے علاوہ یزید کے کرتوت اسلام کے ان آفاقی اصولوں کے لیے بھی سخت خطرناک تھے جو بحیثیت مجموعی عالم انسانیت کے لیے ایک رحمت تھے۔ بالفاظ دیگر یزید نے شریعت اسلام کے خلاف تو بغاوت کی ہی تھی اس کے ساتھ ساتھ

وہ انسانوں سے محبت و ہمدردی کرنا اور اخلاق کا برتاؤ کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا کیونکہ اس انسانی اصول کی پابندی کو وہ اپنی انانیت کی پالیسی کے خلاف سمجھتا تھا یزید نے اپنی اس دشمن اسلام اور دشمن انسانیت پالیسی کے ماتحت ہر طرح کی تنظیم کر رکھی تھی۔ انسانیت کی محافظ رسول اسلام کی نواسی نے اس خطرہ کو پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بالآخر یزید کو اس کی شر پسندیوں میں شکست دے کر دم لیا۔

حضرت زینبؑ بنت علیؑ کے اس رول کا طویل سلسلہ مدینہ سے رخصت ہوتے وقت شروع ہوا تھا اور آج دمشق سے واپس لوٹتے ہوتے وقت ختم ہوا۔ اس کی ابتدا خاتون کربلا کا عزم و ارادہ تھا اور انتہا ایک بے انتہا قابل تعریف کامیابی جب موصوفہ نے یزید کے دارالحکومت میں امام حسینؑ کی صف ماتم بچھا لی اور اپنی سچائی کا کلمہ پڑھوا لیا تب وہ اس جہاد عظیم کی فاتح ہیرو بن کر کربلا ہوتے ہوئے مدینہ واپس ہوئیں۔ ہم اختصار کی وجہ سے ان کی واپسی کے حالات کو نظر انداز کرتے ہیں یقیناً جب سفر کربلا میں اپنے بھائی کی قبر پر پہنچی ہوں گی تب غم اور فخر کے جذبات سے بھری ہوئی ہوں گی اس وقت خاتون کربلا کو اپنے بڑا سے مصائب یاد آئے ہوں گے کیونکہ وہ آج امام کی قبر پر سرخرو ہو کر واپس آرہی تھیں۔ کیا تعجب حضرت زینبؑ نے بھائی کی قبر سے لپٹ کر کہا ہو "کیوں بھیا! میں نے وعدہ نبھا دیا یا نہیں!" بھائی کی روح بہن کے کردار پر فخر کر رہی ہوگی اور بہن کا ذہن آج اس اضطراب سے چھٹکارا پا چکا ہوگا جو کربلا سے چلتے وقت تھا کیونکہ اب حسینؑ کی ہمشیر نے معرکہ کو قطعی اور عملی طور پر سر کر لیا تھا۔

حضرت زینبؑ بنت علیؑ کربلا کے معرکہ سے فرصت پاکر بہت کم دن زندہ رہیں۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ بنت علیؑ کے وجود کا مقصد تعمیر کربلا تھا۔ تاریخوں میں ہے کہ آپ جتنے دن زندہ رہیں برابر گریہ وزاری کرتی رہیں۔ ہمارے سکون قربان خاتون کربلا کے ہر ہر آنسو پر جو دنیا کی ایک عظیم ترین عورت کے آنسو تھے۔

باب نہم ۹

ماحصل

اب تک ہم نے یزدی اور تفصیلی واقعات کے نفسیاتی و منطقی تجزیے سے کردارِ زینبؑ کی کچھ خصوصیات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ حضرت زینبؑ بنت علی کے کردار کو چند اشارات (POINTS) میں بحیثیت مجموعی بھی پیش کیے دیتے ہیں جو اب تک لکھی گئی سطروں کا ماحصل ہوگا گزشتہ تجزیے کی روشنی میں ناظر کو چاہیے کہ ہر واقعہ میں معظمہ کے کردار کی مندرجہ ذیل خصوصیات کو تلاش کرے۔

۱ صبر و استقلال حق کے لیے مصائب کو برداشت کرنا آپکی ایک اہم خصوصیت ہے

۲ وہ سنجیدہ اور پاک جذبات رکھنے والی ایک خاتون تھیں۔ ان کے عمل میں بے انتہا متانت تھی۔

۳ وہ بیک وقت محبت کرنے والی بہن اور محافظ اسلام تھیں۔ ان کے ہر عمل میں احساس ذمہ داری اور فطری جذبات برابر شامل رہے۔

۴ وہ علیؑ ابن ابی طالب جیسے مدبر سیاست داں اور امام زمانہ باپ کی بیٹی تھیں۔ وہ ان علی کی اولاد تھیں جن کے تمام بنی امیہ سخت دشمن تھے، مگر پھر بھی اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی بدولت وہ انھیں دشمنوں سے علی و اولادِ علی کی صداقت کا کلمہ پڑھوا سکیں۔

۵ انھوں نے اسلام کے اصول کی حفاظت کا بیڑا اس وقت اٹھایا جبکہ اسلام پر نازک ترین وقت تھا اور بڑے سے بڑے افراد بھی یزید کی گستاخیوں کے جواب میں لبوں پر مہر لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

۶ آپ کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ نکتہ سنجی، تعقل، دانائی، ہوشمندی اور صبر و استقلال کے خصوصیات آپ کا حصہ تھے اور ان خصوصیات کا مظاہرہ آپ نے نازک سے نازک منزل میں بھی کر دکھایا۔

۷ فن خطابت کی آپ ماہر تھیں۔

۸ دوربینی اور بصیرت (INTELLIGENCE) آپ کے کردار کے خصوصیات تھے۔

۹ یہ نہیں کہ آپ کو اپنے بچوں سے محبت نہیں تھی یا بھائی آپ کو عزیز نہیں تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حق کی حفاظت آپ کو ہر چیز سے زیادہ عزیز اور مقدم تھی۔ اس لیے ہر چیز کو اس پر قربان کر دیا، اور یزید کی گستاخیوں کے آگے کبھی سرنگوں نہ ہوئیں۔

۱۰ امام حسینؑ کی شہادت تک ضمنی طور پر الٰہی مقاصد کی ذمہ دار تھیں، مگر اس کے بعد اصل معرکہ میں وہ اہم ترین حیثیت رکھتی تھیں اور آپ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ہر دو حیثیتوں میں اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے سکیں۔

۱۱ انھوں نے اپنے بے پایاں کردار سے شرعِ اسلام کی حفاظت کی اور اسلام و انسانیت کے آفاقی اصول کی بھی حفاظت کی۔ یزیدیت کو شکست دی اور حسینیت کو سربلند کیا

۱۲ خاتونِ کربلا ایمان کی دولت سے مالا مال تھیں۔ انھیں اپنے خالق و رب کی حمایت پر کامل اعتماد تھا۔ بس انھیں حق کے موقف کی حمایت میں ذرہ برابر تامل نہ تھا۔

۱۳ آپ عالمِ غیب نہ تھیں۔ آپ کو مستقبل کے واقعات کا

علم تعلیم نہ تھا، صرف اندازہ ہی ممکن تھا کیونکہ آپ کا "لدنیہ العلم"
وہی تھا جو عام انسانوں کا ہو سکتا ہے پھر بھی وہ حالات کا
مقابلہ بڑے سکون سے کیا کرتی تھیں۔

۱۴ وہ ایک اچھی ادیب تھیں جو فصاحت و بلاغت کے نکتے
پیدا کرنا خوب جانتی تھیں۔

۱۵ مصائب میں ان کے احساسات مردہ نہیں ہوئے تھے
اضطراب اور سکون برابر ان کے اعمال و اقوال میں ظاہر
ہوتا ہے۔

رسولؐ کی نواسی، علیؑ کی بیٹی، حسینؑ کی بہن اور کربلا کی
فاتح بجا ہے صنف نازک کی اس مایۂ ناز فرد پر ان کے غلاموں کے
درود و سلام۔

السلام علیكِ یا بنت رسول اللہ
اے خدا کے رسول کی بیٹی آپ پر سلام ہو
السلام علیكِ اَیَّتُهَا الرَّضِیَّةُ
اے پاک باطن شہزادی آپ پر سلام ہو
السلام علیكِ عالمةٌ الغَیْرُ المُعَلَّمَةِ
اے باتوں کے بغیر سکھائے جاننے والی شہزادی آپ پر سلام ہو

السلام علیكِ اَیَّتُهَا الفَهِیمَةُ الغَیْرُ المُفَهَّمَةِ
اے بغیر کسی کے سمجھائے سمجھ رکھنے والی بی بی آپ پر سلام ہو
السلام علیكِ اَیَّتُهَا المَظْلُومَةُ
اے مظلوم خاتون آپ پر سلام ہو
السلام علیكِ اَیَّتُهَا المَهْمُومَةُ
اے غمزدہ خاتون آپ پر سلام ہو
السلام علیكِ اَیَّتُهَا المَغْمُومَةُ
اے مغموم بی بی آپ پر سلام ہو
السلام علیكِ اَیَّتُهَا الصَّابِرَةُ
اے بلاؤں پر صبر کرنیوالی آپ پر سلام ہو
السلام علیكِ اَیَّتُهَا المَاسُورَةُ
اے ظالموں میں قید ہونیوالی بی بی آپ پر سلام ہو
فَنِعْمَتِ الْاُخْتُ اَنْتِ لِلْحُسَیْنِ ق
کس قدر اچھی بہن تھیں آپ حسین کی اور کتنے اچھے
نِعْمَ الْاَخُ لَكِ اَبُو عَبْدِ اللّٰهِ صَلَوَاةُ
بھائی تھے حسین آپ کے۔ آپ دونوں پر خدا کی رحمت
اللّٰہ عَلَیْکُمَا۔
نازل ہو۔

قطعہ (۱)

دراصل تھے تفسیر شہادت کا تتمہ
اے بنت علی وہ ترے دربار کے خطبہ
تفصیل ہوئی مقصد شبیر کی جن سے
وہ ثانی زہرا کے تھے بازار کے خطبہ

قطعہ (۲)

بعد شبیر بھی اے ثانی زہرا تو نے
ہاتھ سے مقصد شبیر کو جانے نہ دیا
اب نہ بیعت کی طلب اور نہ بیعت کا سوال
ذکر ہی تیرے تدبر نے یہ آنے نہ دیا۔

سرفراز لکھنؤ
ہفتہ وار
جلد (۳۷) ۲۳ ستمبر ۱۹۵۹ء نمبر (۸)

جسے خدا رکھے اسے کون چکھے

وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر کیسکر نے پریس رجسٹرار کی جو رپورٹ بابت ۱۹۵۸ء لوک سبھا میں پیش کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۷ء کے مقابلہ میں زیر نظر سال میں اخبارات کی اشاعت میں اضافہ ہوا ہے اور یہ اضافہ اردو اخبارات کی اشاعت میں دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ ہوا ہے۔ اردو اخبارات کی اشاعت ۱۶٫۸ فیصدی بڑھی ہے جب کہ مرہٹی اخبارات کی اشاعت میں ۱۲ فیصدی، گجراتی اخبارات کی اشاعت میں ۲۳ء۱۳ فیصدی، ہندی اخبارات کی اشاعت میں ۲ء۱۳ فیصدی اور انگریزی اخبارات کی اشاعت میں ۹ء۸ فیصدی اضافہ ہوا ہے۔

اگر اشاعت میں اضافہ کے لحاظ سے اردو کا پہلا نمبر ہے تو تعداد کے لحاظ سے اس کا نمبر تیسرا ہے یعنی انگریزی اور ہندی کو چھوڑ کر باقی تمام زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات سے اردو سب سے آگے ہے۔ بنگالی، گجراتی اور مرہٹی جیسی باگئی زبانیں ہیں اور وہ لٹریچر کے اعتبار سے بھی دولت مند زبانیں سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن اردو ان سے بھی گوئے سبقت لے گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ زبانیں علاقائی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک زبان کے بولنے والے ایک مخصوص حدود علاقہ میں آباد ہیں برخلاف اس کے اردو تمام ملک پر چھائی ہوئی ہے اور اس کی حیثیت "برِ اعظم ہند" میں ایک بین الاقوامی زبان (LINGUA FRANCA) کی ہے جو ہر صوبہ میں بولی جاتی ہے اور سمجھی جا سکتی ہے۔ ملک کے کسی حصہ میں چلے جائیے آپ اردو کے ذریعہ ہر جگہ اپنا کام نکال لیں گے۔ یہ خصوصیت ملک کی کسی دوسری علاقائی زبان کو حاصل نہیں ہے۔

مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے کل اخبارات کی تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی اردو کا تیسرا نمبر نظر آتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو ملک کی ایک زندہ زبان ہے اور اس کا حلقہ اثر اب بھی بہت وسیع ہے۔

سب زبانوں کے اخبارات کے تناسب پر نظر ڈالیے آپ کو اردو کی پوزیشن بہت بلند نظر آئے گی۔

انگریزی	۲۰ء۱ فیصدی
ہندی	۱۸ء۳ "
اردو	۱ء۲ "
بنگالی	۷ء۱ "
گجراتی	۶ء۶ "
مرہٹی	۵ء۴ "

نئے اخبارات پر نظر ڈالیے تو اس اعتبار سے بھی اردو کی پوزیشن خاصی بلند معلوم ہوتی ہے مثلاً ۱۹۵۸ء میں ۱۰۶۲ نئے اخبارات نکلنا شروع ہوئے۔ ان میں انگریزی کے [illegible] ہندی کے ۱۸۳، اردو کے ۱۰۱، گجراتی کے ۴۳ اور بنگالی کے ۶۹ اخبارات شامل تھے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جہاں تک دوڑ میں اردو کس طرح انگریزی اور ہندی جیسی زندہ اور ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ شانہ بشانہ ملائے ہوئے دوڑی چلی جا رہی ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ملک بھر میں شائع ہونے والے اخبارات کی مجموعی تعداد ۶۹۱۸ تھی جب کہ گزشتہ سال ۵۹۳۲ اخبارات شائع ہوتے تھے۔ اس رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے اخبارات زیادہ تر پنجاب، دہلی، اتر پردیش، بمبئی اور آندھرا میں شائع ہوتے ہیں جن کی علی الترتیب تعداد حسب ذیل ہے:

پنجاب	۱۴۴	اردو اخبارات
دہلی	۱۳۵	" "

DUE DATE ۹۲۲۶۹۷

1975

Date | No. | Date | No

۸۱۰۳۷